۲۷

بازیافت

مدیر ڈاکٹر محمد کامران

شعبۂ اُردو اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بازیافت

تحقیقی و تنقیدی مجلہ

بازیافت

تحقیقی و تنقیدی مجلّہ

شبلی نمبر

۲۷

جولائی - دسمبر ۲۰۱۵ء

مدیر

ڈاکٹر محمد کامران

معاونین

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر

شعبۂ اردو

اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

☆ بازیافت ہائرایجوکیشن کمیشن سے Y کیٹگری میں منظور شدہ مجلّہ ہے۔

☆ بازیافت کے سال میں دو شمارے شائع کیے جاتے ہیں۔

☆ بازیافت میں شائع ہونے والے مقالات غیرملکی اور ملکی ماہرین کے پاس جانچ/حتمی منظوری کے لیے ارسال کیے جاتے ہیں۔

☆ اپنے مقالے کے ساتھ اُس کا انگریزی ملخّص (Abstract) ضرور شامل کیجیے۔

☆ ملخّص کے بغیر مقالہ مجلس ادارت میں پیش نہیں کیا جائے گا۔

☆ بازیافت میں اشاعت کی غرض سے (اِن پیج میں) کمپوز شدہ مضمون کی ایک سافٹ کاپی اور دو ہارڈ کاپیاں ارسال کیجیے۔

☆ تمام مقالات نیک نیتی اور علمی خدمت کے جذبے کے تحت شائع کیے جاتے ہیں۔ مقالہ نگاروں کی آراء سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

ناشر: پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران، چیئرمین شعبۂ اردو
مطبع: پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور
کمپوزنگ/سرورق: شعبۂ اردو، یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور (فون:۰۴۲-۹۹۲۱۰۸۳۲)
قیمت: پاکستان: ۴۰۰ روپے
بیرونِ پاکستان: ۲۰-امریکی ڈالر

برائے رابطہ: مدیر، بازیافت، شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
فون نمبر: ۰۴۲-۹۹۲۱۰۸۳۲ ای میل: bazyafturdu@gmail.com

ترتیب

اداریہ

شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور کو تدریس، تحقیق، تنقید اور تخلیق کے حوالے سے امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ تحقیقی مجلّہ ''بازیافت'' شعبۂ اردو کے فکری سفر کا ایک روشن سنگ میل ہے۔ ''بازیافت'' کو ہائیر ایجوکیشن کمیشن پاکستان نے "Y" کے درجے میں ترقی دے کر اس کی علمی اہمیت وافادیت کا اعتراف کیا ہے۔

''بازیافت'' کا بنیادی منصب علمی مکالمے کا فروغ ہے، کیوں کہ یہی مکالمہ ہی فکر ونظر کی دنیا میں حیات افروز نشانِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۶ مئی ۲۰۱۵ء کو شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج نے اردو ادب کے دو عظیم معماروں مولانا شبلی نعمانی اور مولانا الطاف حسین حالی کے علمی وفکری کارہائے نمایاں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے حالی، شبلی صدی قومی سیمینار کا اہتمام کیا تھا۔ مذکورہ سیمینار کی صدارت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران نے کی جب کہ مہمانِ خصوصی عصرِ حاضر کے ممتاز تخلیق کار جناب انتظار حسین تھے۔ کلیدی مقالہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (پروفیسر ایمریطس اردو) پنجاب یونیورسٹی نے پیش کیا۔ ۷ مئی ۲۰۱۵ء کو بیادِ حالی وشبلی ایک قومی مشاعرہ، فیصل آڈیٹوریم پنجاب یونیورسٹی میں منعقد کیا گیا۔

مذکورہ سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کے علاوہ یارانِ نکتہ داں نے بھی ''بازیافت'' میں اشاعت کی غرض سے مقالات ارسال کیے، مقالات کی جانچ پرکھ اور ضابطے کی کارروائی کے بعد مجلسِ ادارت نے فیصلہ کیا کہ ''بازیافت'' کا شمارہ ۲۷ بیادِ شبلی اور شمارہ ۲۸ بیادِ حالی شائع کیا جائے۔ زیرِ نظر شمارہ مولانا شبلی نعمانی جیسی نابغہ روزگار شخصیت کی حیات اور فکر وفن کے متعدد گوشوں کو منور کرتا ہے۔ امید ہے کہ ہماری یہ کوشش شبلی شناسی میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوگی۔

مدیر

پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران

علامہ شبلی کا ایک ایرانی مداح و مترجم

ڈاکٹر تحسین فراقی

ABSTRACT:

Though Allama Shibli has immensely been acknowledged and praised for his contribution especially in Persian Literature by number of Irani Scholars and men of letters yet another Irani intellectual Fakhar Da'ee Gilani is worth mentioning in this regard. He is the first who introduced Shibli with the Iranians. He met Shibli number of times. He published very nice translations of Shibli's many books. This article is an account of Gilani's life and work with special reference to Allama Shibli Naumani.

علامہ شبلی کی علمی فضیلت، وسعتِ نظر یا فارسی ادبیات کے ضمن میں ان کی غیر معمولی خدمات کا اعتراف متعدد ایرانی فضلا اور بعض ادبا نے کیا ہے جن میں عبدالوہاب قزوینی، مشایخ فریدنی، احمد گلچین معانی، عباس مہرین شوشتری اور محمد شفیعی کدکنی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ عبدالوہاب قزوینی علوم اسلامی اور اردو، فارسی اور عربی زبان و ادبیات میں ان کی وسیع اطلاعات کے معترف ہیں (۱)۔ مشایخ فریدنی انھیں ''ایران شناس مشہورِ ہند'' قرار دیتے ہیں (۲) احمد گلچین معانی اپنی عالمانہ کتاب ''کاروانِ ہند'' کی دونوں جلدوں میں جگہ جگہ ان کے حوالے دیتے ہیں (۳) انھیں کہیں ''علامہ شبلی'' لکھتے ہیں، کہیں ''مولانا شبلی''۔ ''تاریخ تذکرہ ہای فارسی'' میں ''شعرالعجم'' کی لغزشوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس کتاب کو بہت قیمتی اور سود مند قرار دیتے ہیں (۴) عباس مہرین شوشتری کی کتاب ''تاریخ و ادبیات ایران در خارج از ایران'' میں انھیں ''نویسندۂ یگانہ'' لکھا گیا ہے (اگرچہ ان کے بعض تاریخی نکات کے موردِ انتقاد ہونے کا بھی اظہار کیا ہے) (۵) نامور نقاد اور ادیب محمد شفیعی کدکنی نے ''صور خیال در شعر فارسی'' میں کم از کم آٹھ جگہ ان کے اقتباس دیے ہیں اور ان کے تنقیدی نکات کی داد دی ہے (۶)

شبلی کے بارے میں ان سب معترفین کے کلماتِ تحسین اور حوالے اپنی جگہ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اس باب میں ایک اور ایرانی دانش ور فخر داعی گیلانی کے تاثرات و خدمات تفصیل سے درج کیے جانے کے متقاضی ہیں۔

عبدالوہاب قزوینی کے مختصر تاثر سے قطع نظر باقی تمام مذکورہ مصنفین پر فخر داعی گیلانی کو تقدم حاصل ہے کہ انھوں نے پہلی بار شبلی کو تفصیل کے ساتھ اہل ایران سے متعارف کرایا۔ انھیں شبلی سے متعدد ملاقاتوں کا شرف بھی حاصل رہا۔ ایران واپس جا کر انھوں نے علامہ کی متعدد تصانیف کے عمدہ فارسی ترجمے شائع کیے۔ شبلی کے علم وفضل کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے جابجا انھیں نویسندۂ نامی ومتبحر، مرد دانش مند، مولف دانش مند، علامۂ نبیل، عالم شہیر، علامۂ شہیر، مردِ بزرگ، ادبیات عربی و فارسی میں مقام بلند کا حامل، دانشمند شہیر، خطاب ونطق میں ید طولیٰ رکھنے والا، مردِ نامی اور نویسندۂ متعمق جیسے القابات سے یاد کیا ہے۔

آیئے سب سے پہلے علامہ شبلی کے اس مداح ومترجم کا تعارف حاصل کرتے ہیں:

فخر داعی گیلانی محقق اور عالم تھے۔ متعدد زبانوں سے آگاہ تھے تاہم ان کی سب سے نمایاں حیثیت مترجم کی ہے۔ ان کا اصل نام سید محمد تقی گیلانی تھا اور لقب فخر المحققین۔ ولادت ۱۸۸۱ء۔ گیلان سے نسبت رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی۔ جوانی میں تہران چلے گئے اور وہاں چند سال تک حکمت، فلسفہ اور دینیات کی تعلیم حاصل کی۔ شیخ محمد طالقانی، آقا میرزا مسیح سمنانی اور فاضل تفرشی جیسے اساتذہ سے فیض یاب ہوئے۔ بعد ازاں تکمیل درس کے لیے عراق گئے اور ملا عبداللہ مازندرانی اور آخوند محمد کاظم خراسانی سے کسب علوم کیا اور ان سے اجتہاد کا اجازت نامہ حاصل کیا۔ ایران میں تحریک مشروطہ کا آغاز ہوا تو اپنے استاد آخوند خراسانی کے ایما پر عراق میں مقیم آزادی خواہوں کے گروہ میں شامل ہوگئے۔ بعد میں انھی استاد کے حکم پر جدید مطالعات اور دعوت وتبلیغ کے لیے عازم ہندوستان ہوئے۔ بمبئی میں مقیم ہوئے۔ یہاں وہ انجمن دعوتِ اسلام سے وابستہ رہے۔ فخر داعی پندرہ برس ہندوستان میں رہے اور وہیں انگریزی اور اردو زبانوں کی تحصیل کی۔ اس کے بعد چار سال تک اندور کالج میں ادبیات فارسی، عربی اور فلسفہ وحکمت کا درس دیتے رہے۔ مسلمانوں کے امور کی سرپرستی کے باعث ''داعی الاسلام'' کے لقب سے اور بعد ازاں تدریس وتحقیق کے باعث ''فخر المحققین'' کے لقب سے ملقب ہوئے۔ برعظیم کے متعدد شہروں کی سیر کی اور وہاں کے اکابر ادب سے دوستی کی۔ انھی میں شبلی نعمانی بھی شامل تھے۔ جنگِ عظیم اول کے خاتمے پر واپس ایران چلے گئے اور وزارت معارف وعلوم اور صنائع مستظرفہ سے وابستہ رہے۔ ادارۂ معارف خوزستان کے پہلے سربراہ ہونے کا شرف بھی انھیں کو حاصل ہوا۔ ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے انھیں سر پر سائیکس میڈل سے اور وزارت فرہنگ ایران نے انھیں ''نشانِ ایران'' سے نوازا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی وزارت تعلیم کے دوران حکومت ہند کی جانب سے بھی چند تعریفی سرٹیفکیٹ حاصل کیے۔

فخر داعی گیلانی، انگریزی، فرانسیسی، عربی اور اردو سے بخوبی آگاہ تھے۔ انھوں نے ان زبانوں کی کئی کتب کو فارسی میں منتقل کیا۔ بیاسی تراسی سال کی عمر پا کر تہران میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مدفن قم میں ہوئی۔

فخر داعی گیلانی نے متعدد کتب کے فارسی میں ترجمے کیے جن میں دانیال ویفو، گستاولی بان اور سر پرسی سائیکس کی کتب مشہور ہیں۔ برعظیم کے تناظر میں انھیں علامہ شبلی سے خاص لگاؤ تھا۔ شبلی کی متعدد کتب کے بہت عمدہ تراجم کیے جن میں کتب خانۂ اسکندریہ (۱۸۹۲ء)، رسائل شبلی (۱۸۹۸ء)، علم الکلام (۱۹۰۳ء)، الکلام (۱۹۰۴ء)،

سوانح مولانا روم (۱۹۰۶ء) اور شعرالعجم (۱۹۰۹ء۔۱۹۱۸ء) شامل ہیں۔ فخر داعی گیلانی سرسید کے بھی مداح تھے۔ ان کی تفسیر القرآن کے بعض حصوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ دو جلدوں میں شائع ہوا (۷) فخر داعی گیلانی نے ۱۹۶۴ میں انتقال کیا۔ (۸)

فخر داعی گیلانی، علامہ شبلی کی شخصیت اور وسعتِ علم دونو کے مداح و معترف تھے۔ آیئے سب سے پہلے دیکھتے ہیں کہ داعی نے شبلی کی عالمانہ تصنیف ''کتاب خانۂ اسکندریہ'' کے فارسی ترجمے (۱۹۳۶ء) کے دیباچے میں ان کے بارے میں کیا لکھتے ہیں۔ فخر داعی کا کہنا ہے کہ شبلی:

ہندوستان کی قرنِ حاضر کے نامور ادیب ہیں جو عصری علوم اجتماعی پر جامع تحریروں کے باعث تمام متمدن دنیا میں معروف ہیں۔ خاص طور پر مصر اور بیروت کی مطبوعات میں ان کا بڑی شان سے ذکر ملتا ہے۔ تاریخی، مذہبی اور ادبی مباحث پر مشتمل ان کی تصانیف سے استناد کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ پروفیسر ایڈورڈ براؤن انگلستانی نے بھی متعدد مقامات پر ان کے کلمات سے استشہاد کیا ہے۔

شبلی نے چند رسالے مختلف موضوعات پر بھی تصنیف کیے جو رسائل شبلی کے نام سے موسوم ہیں۔ انھی میں ایک رسالہ ''کتب خانۂ اسکندریہ'' ہے جس میں اسکندریہ کے قدیم کتب خانے کے جلائے جانے کا ذکر ہے اور جس کا ذمہ دار یورپی اقوام میں اب تک مسلمانوں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ شبلی اس موضوع کو زیر بحث لائے ہیں اور عصر حاضر کے تحقیقی اصولوں کو بروئے کار لاکر عقلی و نقلی شواہد کی روشنی میں اور خود یورپی لکھنے والوں کے اقوال کی مدد سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ عمل خود نصاریٰ کے مذہبی و سیاسی پیشواؤں کا کیا دھرا ہے۔ ایرانی مذہبی رہنما، شہید مطہری نے بھی اس الزام کے رد میں ''کتاب سوزی ایران و مصر'' لکھی (۹) لیکن ''الفضل للمتقدم'' کی ابدی صداقت کے پیشِ نظر شبلی جدید عالم اسلام کے پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور موضوع کا حق ادا کردیا۔

قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ شبلی نے اس موضوع کو کاملاً کھنگالا کہ کوئی شبہ باقی نہ رہا۔ یوں یہ کتاب نہ صرف مبسوط ہے بل کہ ساتھ ہی ساتھ دل چسپ بھی ہے۔ وہ تحقیق کے امور سے اس قدر عمدہ انداز میں عہدہ برآ ہوئے کہ اس موضوع پر معاصر کتابوں میں اس کی مثال نایاب کے حدود میں داخل ہے۔ داعی نے شبلی کی وسعت معلومات، آزادہ نگاری، دقتِ نظر اور فصاحتِ فکر کی داد دی ہے۔ ان کے نزدیک شبلی کا یہ رسالہ اس اعتبار سے بھی مفید ہے کہ انھوں نے روایت اور درایت کے اصول و قواعد کے مطابق بڑی دقتِ نظر سے مسئلے کا جائزہ لیا ہے۔ یہ وہ اسلوب تحقیق ہے جو مورخین و محققین اسلام کے درمیان تاریخی مسائل و اخبار کے ناتے پانچویں صدی ہجری تک معمول اور متداول رہا اور بعدازاں یہ روش (بدقسمتی سے) باقی نہ رہی۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''میں نے چند سال قبل بڑی دقتِ نظر سے اسے اردو سے فارسی میں ڈھالا۔ اور اس کی تصحیح و تکمیل میں لگا رہا''

حقیقت یہ ہے کہ داعی کا مندرجہ بالا بیان حقیقت سے بڑی مطابقت رکھتا ہے۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر مجموعی حیثیت سے یہ بڑا کامیاب ترجمہ ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر یہاں نمونے کے طور پر اصل متن اور اس کے فارسی ترجمے

کا ایک ایک اقتباس درج کردیا جائے تا کہ قارئین خود دونوں کا تقابل کرکے ترجمے کے حسن وخوبی کا اندازہ کرسکیں۔ شبلی نے کتاب خانۂ اسکندریہ کے مسلمانوں کے ہاتھوں جلائے جانے کی تردید کرتے ہوئے ایک دلیل یہ دی ہے:

''اس واقعہ کے بے اصل ہونے کی ایک نہایت قوی دلیل یہ ہے کہ جس کتب خانے کا جلایا جانا بیان کیا جاتا ہے، وہ اسلام کے دَور سے پہلے ہی برباد ہو چکا تھا۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ کتب خانہ شاہانِ مصر نے جو بت پرست اور بہت سے خداؤں کے ماننے والے تھے، قائم کیا تھا۔ جب مصر میں عیسائیت کا دورہ ہوا تو عیسائی بادشاہوں نے تعصب مذہبی کی وجہ سے ان کتابوں کی بربادی شروع کی اور ان کے پاسِ ارادہ کو پادریوں نے اور بھی اشتعال دیا'' (۱۰)

فارسی متن:

"یک دلیل عمده و قوی در بی اصل بودن این واقعه آن است کتابخانه ای که سوزاندن آنرا ذکر می کنند پیش از ظهور اسلام این کتابخانه برباد رفته بود و حقیقت آنست که کتابخانهٔ مذبوره را سلاطینِ بت پرست مصر که خدایانِ عدیده را پرستش می کردند تاسیس کرده بودند. زمانیکه دیانت مسیح در مصر انتشار پیدا نمود، سلاطینِ عیسوی براثر تعصب مذهبی شروع به انهدامِ این کتابها نموده و مخصوصاً کشیشان بیشتر دامن به آتش زده در اجرای این منظور سهم وافری گرفتند" (۱۱)

قارئین بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ فخر داعی گیلانی نے مندرجہ بالا اُردو اقتباس کا کس قدر کامیاب اور رواں دواں لفظی ترجمہ کیا ہے اور کوئی مطلب یا جملہ حذف نہیں کیا۔

فخر داعی گیلانی نے یوں تو علامہ شبلی کی مختصر کتاب یا مقالے کتب خانۂ اسکندریہ کے فارسی ترجمے ''کتاب خانۂ اسکندریہ'' کے دیباچے میں بھی شبلی خصوصاً ان کی علمی فضیلت کا مختصر احوال لکھا ہے جو اوپر درج ہوا مگر ان کے بارے میں تفصیلی اور بڑا دلچسپ تذکرہ شبلی کی علم الکلام اور الکلام کے فارسی ترجمے ''تاریخ علم الکلام'' (۱۹۳۹ء) اور ''علم کلام جدید'' (۱۹۵۰ء) میں کیا ہے۔ یہ شخصی حوالے بعد کے تراجم مثلاً ''سوانح مولوی رومی'' (۱۹۵۳ء) اور ''شعرالعجم'' (۱۹۵۵ء) وغیرہ کے مقدموں میں بھی ملتے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ شبلی کی شخصیت کے یہ خاکے کیسے ہیں:

یہ بات معلوم ہے کہ فخر داعی گیلانی علوم جدید کے حصول اور دعوت و تبلیغ کے لیے عراق سے ۱۹۱۰ء میں بمبئی آئے تھے۔ مختلف مذاہب کے پیروکاروں اور جدید طرزِ زیست کے حامل اس شہر میں وارد ہونے کے بعد انھوں نے اپنے تاثرات بڑے دلچسپ اور چشم کشا انداز میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میں اس جگہ ایک نئی دنیا کے مقابل آکھڑا ہوا۔ اس دنیا اور میری سابقہ دنیا میں زمین آسمان کا

فرق تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس جدید دنیا میں پرانے اسلوب زیست کے ساتھ زندگی کرنا ممکن نہیں۔ مجھے ایک چینی شاعر کا مقولہ یاد آیا جس نے کہا تھا کہ جو "دانہ نشوونما چاہتا ہے اسے چاہیے کہ دانے ہی کی طرح اپنے آپ سے دست بردار ہو جائے۔

لہٰذا میں نے مُلائی کی ظاہری حیثیت کو ٹھکرا دیا اور سرتاپا جدید مطالعات میں غرق ہو گیا۔ اس ضمن میں مَیں نے انگریزی زبان و ادب اور اُردو کے مطالعے کی جانب پہلا قدم اُٹھایا۔"

اس دوران مشہور دانش ور شبلی نعمانی سیر و سیاحت کے لیے بمبئی آئے (۱۲) اتفاق سے انھوں نے اسی محلے میں ورود فرمایا جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرا کمرہ ان کی اقامت گاہ سے متصل تھا، چوں کہ میں نے اس بزرگوار کی شہرت پہلے سے سُن رکھی تھی لہٰذا چاہتا تھا کہ فوراً ان کی زیارت کا شرف حاصل کروں۔

میری نگاہ ایک ایسے وجود پر پڑی جو صاف ستھرے لباس اور جبہ وقبہ میں ملبوس تھا اور اس سے عظمت اور معرفت کے آثار نمایاں تھے۔ انھوں نے بڑی محبت اور مہربانی سے مجھے اپنے نزدیک بٹھایا۔ کافی دیر تک مجھ سے مختلف موضوعات پر شگفتہ روئی اور بشاشت کے ساتھ گفت گو کی۔ اس زمانے کے ایران کے انقلابی مگر ساتھ ساتھ پرآشوب حالات بھی زیر بحث آئے۔ وہ حکومت ایران میں مشروطیت کے نتیجے میں پارلیمنٹ کے قیام پر بڑے خوش تھے مگر آذر بائیجان کے افسوس ناک احوال و واقعات پر دل گرفتہ تھے (۱۳) کہنے لگے میں اس وقت لکھنؤ میں تھا اور میں نے آذر بائیجان میں ہونے والے مظالم کے خلاف ایک جلسہ برپا کر کے آواز بلند کی تھی اور اخبارات کو تار دیے تھے۔

ایک دو ملاقاتوں میں مَیں اس نامور شخصیت کے بلند علمی مقام اور جامعیت کا شیفتہ ہو گیا اور خوش قسمتی سے ایسے اتفاقات ہوتے رہے کہ میں ان کی مصاحبت سے فیض یاب ہوتا رہا۔ بعد کی ایک ملاقات میں انھوں نے میرے کمرے میں آکر مجھے مشرف کیا اور فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے قیام بمبئی کے دوران میں اور آپ دوپہر اور شام کا کھانا اکٹھے کھایا کریں۔ مجھے اس پیش کش کے قبول کرنے میں کسی قدر تامل تھا مگر انھوں نے کمال بے تکلفی اور شرح صدر کے ساتھ جو ارباب دانش و کمال کا شیوہ ہوتا ہے، فرمایا کہ چوں کہ میں چاہتا ہوں کہ ہم ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ مانوس ہو جائیں سو اگر آپ میری پیش کش کو قبول کرنے میں متامل ہیں تو ایسا کریں کہ جو کھانا آپ اپنے لیے تیار کرتے ہیں وہ یہاں لے آیا کریں۔ میری غذا اس وقت بڑی سادہ اور ناچیز ہوتی تھی جب کہ شبلی کے ہمراہ ایک ذاتی باورچی تھا جو ان کے لیے بہترین اور نہایت مرغوب اور مزے کے کھانے تیار کرتا تھا۔

چوں کہ میں اس استاد بزرگوار کے قیام سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے ان کی تجویز سے اتفاق کیا۔ فراغت کے ان اوقات میں مَیں ان کے خرمن علم سے خوشہ چینی کرتا رہا۔ میں متعدد سوالات اور مسائل ان کے گوش گزار کرتا۔ وہ ان کے کامل اور شافی جواب اور حل مہیا کرتے۔ کبھی کبھی مجھے اپنے کمرۂ تحریر میں بھی لے جاتے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شبلی اپنے تمام سفروں میں متحرک کتب خانہ (کتب خانۂ سیار)

اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اپنی منزل پر پہنچ کر سب سے پہلے اپنے تحریر و انشا کے کمرے کو مرتب کرواتے۔ سفر میں ہوں یا حضر میں روزانہ چار گھنٹے تصنیف و تالیف پر صرف کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ جب سے میں نے لکھنے کا آغاز کیا تو اس معمول میں فرق نہ آنے دیا۔ ایک دفعہ میں نے ان سے پوچھا کہ روزانہ چار گھنٹے کام کر کے وہ کیسے اس قابل ہوئے کہ اتنی ڈھیر ساری تالیفات وجود میں آگئیں۔ فرمایا: کسی بھی کام کی عمدہ پیش رفت کے لیے اصل چیز تسلسل اور انضباط ہے۔ زیادہ کام کرنا اور ڈھال ہو کر گھل جانا نہیں۔

فخر داعی گیلانی ''سوانح مولوی روی'' کے مقدمے میں بھی علامہ شبلی کے بارے اپنے تاثرات بڑی صراحت اور کمال عقیدت سے بیان کرتے ہیں اور اس طرح سے شبلی کی جیتی جاگتی بے تکلف زندگی کی پرتیں کھلنے لگتی ہیں۔ لکھتے ہیں:

میں خود جنگ عظیم اول سے کچھ عرصہ پہلے استاد بزرگوار کی پرنور صحبت سے فیض اندوز رہا ہوں۔ وہ سچائی اور لہجے کی صراحت سے متصف تھے۔ اپنی غیر معمولی دانش و علم کے باوجود غرور اور عالمانہ کبر کے قریب بھی نہ پھٹکے تھے۔ حد درجہ متواضع، منکسر اور بے تکلف تھے۔ بڑے لطیف مزاج، شوخ اور بذلہ سنج تھے۔ ان کی روح کی نشاط، چہرے بشرے کی جاذبیت، لطف صحبت، کشادہ روئی اور سب سے بڑھ کر لطف کلام ہی کی بدولت ہر شخص ان سے بات چیت کر کے محظوظ ہوتا تھا۔ ان میں طبیعت کی رفعت اور خود داری اس درجے کی تھی کہ سلاطین و امرا کے انعامات اور ہدایا کو قبول نہیں کرتے تھے۔ ممالک اسلامی کی سیاحت میں تمام اخراجات خود برداشت کیے۔ تین زبانوں میں شعر کہتے تھے مگر کسی کا قصیدہ نہیں کہا۔ حیدر آباد کے ایک ثروت مند وزیر نے انھیں انعام و اکرام سے نوازنا چاہا۔ ایما یہ تھا کہ شبلی ان کا قصیدہ لکھیں۔ فرمایا یہ میری عادت کے خلاف ہے۔ دوبارہ اظہار کیا گیا تو شبلی نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور فرمایا: میرے لیے ممکن نہیں کہ کسی کا قصیدہ کہوں۔

کتاب خوانی اور لکھنے پڑھنے سے عشق تھا (۱۴) کتاب ان کی بہترین مصاحب تھی اور اس کی لذت کو ہر لذت پر ترجیح دیتے تھے۔ ان کی تحریروں پر جو ایرادات اور اعتراضات ہوئے اور ہوتے رہے ان کا کبھی جواب نہ دیا۔ بعض مواقع پر ان کے شاگرد اور عقیدت مند ان کے حضور میں تشویش کا اظہار کرتے اور جواب لکھنے کو کہتے تو فرماتے، جو وقت اس کام میں صرف کروں گا بہتر نہ ہوگا کہ اسے کسی نئے اور مفید علمی کام میں صرف کروں۔

فخر داعی گیلانی نے شبلی کی عزت نفس، خودداری اور معترضین سے اعراض جیسے امور کا ذکر کیا ہے۔ ان امور کی تصدیق سید سلیمان ندوی کی عمدہ سوانحی تصنیف ''حیات شبلی'' اور بعض دیگر تحریروں سے بخوبی ہوتی ہے۔ نواب محسن الملک کے نام ایک خط میں شبلی نے کس قدر سچ کہا تھا:

> ''مجھ سے جوڑ توڑ، سازش، دربارداری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت نہیں ہوسکتی اور بغیر اس کے کامیابی معلوم'' (۱۵)

اب ہم آتے ہیں شبلی کی شعرالعجم کی طرف۔ فخر داعی گیلانی نے اس کی پانچوں جلدوں کا فارسی میں ترجمہ کیا اور ان پر مفصل مقدمے لکھے۔ پہلی جلد کے مقدمے میں شبلی کے حالات زندگی اجمالاً لکھنے کے بعد ان سے اپنی

ملاقاتوں کا دلچسپ احوال لکھتے ہیں:

اگر چہ ان کی عمر اس وقت کوئی زیادہ نہ تھی لیکن تحریر و مطالعہ کی کثرت کے باعث شکستہ اور بوڑھے دکھائی دیتے تھے تاہم ان کی روحانی نشاط حیرت انگیز تھی۔ ظرافت اور لطفِ بیان میں بے نظیر تھے۔ شاعری سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے وجود کو اچھا شعر ہر شے سے زیادہ متاثر کرتا تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ایک دن اثنائے ملاقات میں حافظ کے یہ شعر پڑھے:

مشکلِ خویش بر پیر مغاں بُردم دوش کو بہ تائید نظر حل معمّا می کرد!
دیدمش خرم و خندان قدحِ بادہ بدست وندر آن آئینہ صد گونہ تماشا می کرد
گفتم این جامِ جہاں بیں بتو کے داد حکیم گفت آن روز کہ این گنبدِ مینا می کرد

میں نے دیکھا کہ ان پر وجد کی حالت طاری ہو گئی تھی اور وہ اس کیفیت میں جھوم رہے تھے۔ پھر تبسم کیا اور فرمایا اگر مجھے پورا ایران بھی دے دیا جائے تو مجھے وہ مسرت اور کیف حاصل نہ ہوگا جو ان تین شعروں سے حاصل ہوتا ہے۔

شبلی کو روحانی مسرت اور باطنی نشاط سے اس قدر بہرۂ وافر عطا ہوا تھا کہ بڑھاپے اور شکستگی کے باوجود جس پر ایک مصنوعی پاؤں (۱۶) مستزاد تھا، بلا ناغہ عصر کے بعد اسی چوبیں پاؤں کے باوجود سیر و تفریح کو نکلتے اور بعض اوقات مجھے بھی اپنے ہمراہ لے جاتے۔

فخر داعی گیلانی، شبلی کے علمی آثار سے حد درجہ متاثر تھے۔ اگر ایک طرف ان کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں شبلی کی صحبت سے فیضیاب ہونے کے مواقع ملے تو دوسری طرف خود شبلی کی خوش بختی ہے کہ ان کی بعض کتابوں کو فخر داعی گیلانی جیسا مترجم نصیب ہوا۔ داعی گیلانی ان ممتاز ادبا و مترجمین میں سے تھے جو کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ وہ عربی، فرانسیسی، انگریزی اور اردو سے آگاہ تھے۔ میں نے سوائے ''مجموعہ مقالات شبلی'' (فارسی ترجمہ) کے جو تا حال مجھے دستیاب نہیں ہو سکی، داعی گیلانی کے شبلی سے متعلق باقی تمام تراجم کو جستہ جستہ دیکھا ہے اور ان کا اصل اردو متن سے تقابل کیا ہے۔ گیلانی کے ان تراجم کو نہایت کامیاب ترجمے قرار دیا جا سکتا ہے۔ پہلے ایڈیشنوں پر گیلانی نے کمال دقت سے نظر ثانی کی۔ اب ان تراجم کو اصل کے بہترین قائم مقام قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک سہو کی نشان دہی البتہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ داعی گیلانی نے شبلی کے انگریز معاصر اور ہم کار ٹامس آرنلڈ کا نام غلطی سے میتھیو آرنلڈ لکھ دیا ہے (۱۷) میتھیو آرنلڈ (م ۱۸۸۸ء) شاعر اور نقاد تھا۔

یہاں اس امر کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ فخر داعی گیلانی کے ''شعر العجم'' کے ترجمے پر افغانستان میں ہونے والا ترجمہ مقدم ہے (۱۸) لیکن جیسا کہ آقای سعید نفیسی کی رائے ہے کہ ''این ترجمہ ایرانیان را ساز گار نمی افتاد و زیرا کہ بزبانِ فارسی مانوسِ ایران نبود و چاپ ناھموار آن رغبت را برنمی انگیخت۔'' (۱۹)

ترجمے کے بارے میں ایک مقولہ بڑا مشہور ہے کہ اس کی مثال اس خاتون کی سی ہوتی ہے کہ اگر وفادار ہو تو خوب صورت نہیں ہوتی اور اگر خوب صورت ہو تو وفادار نہیں ہوتی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک پاکستانی بزرگ نے

''افواج قاہرہ'' کا انگریزی ترجمہ ''Forces of CAIRO'' کیا تھا اور ایک دوسرے صاحب نے ''ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذت رم سے'' میں لذت رم کا ترجمہ ''Taste of rum'' کیا تھا۔ ان کے خیال میں ''رم'' سے مراد وہ نشہ آور مشروب تھا جو گنے کے رس سے تیار ہوتا ہے! فخر داعی گیلانی کے یہاں شاید ہی کوئی ایسی بوالعجبی نظر آئے۔ پھر انھوں نے اس ترجمے پر جابجا توضیحی حواشی لکھے ہیں وہ نہایت مفید ہیں اور مترجم کی وسعت علم کی گواہی دیتے ہیں۔

داعی گیلانی نے شبلی کی جن کتب و رسائل کے ترجمے کیے، ان کی افادیت، گہرائی اور نکتہ طرازی کے وہ بے حد مداح تھے۔ ''شعرالعجم'' کی پہلی جلد کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ایک معاصر ادیب کا قول ہے کہ ہر اچھی کتاب کو کم از کم تین بار ضرور پڑھنا چاہیے۔ پھر فرانسس بیکن کا مشہور قول نقل کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض کتابوں کو محض چکھنا چاہیے اور بعض کو ایک ہی بار نگل لینا چاہیے مگر چند کتابیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنھیں مکمل طور پر چبانا چاہیے یعنی اس کے ہر ہر جز کو نہایت دقت نظر سے اور سمجھ کے مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہماری نظر میں شبلی کی ''شعرالعجم'' بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے کہ اس کے تمام اجزا کو گہری نظر سے غیر جانب دار ہو کر اور نہایت بے تعصبی کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔

''شعرالعجم'' کی جامعیت اور وسعت کی تعریف کرتے ہوئے داعی گیلانی شبلی سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اگرچہ فارسی شاعری تنہا دنیا کی شاعری کے مقابل کھڑی کی جاسکتی ہے مگر یہ کہ اس شاعری کا آغاز کب ہوا، اس کے ظہور کے علل و اسباب کیا تھے، اس نے ارتقا کے مرحلے کیسے طے کیے۔ اس میں مرور وقت کے ساتھ پیدا ہونے والے تغیرات کیا تھے اور سماجی حالات و واقعات نے اس کو کس طرح متاثر کیا یا قوم کی سیاسی و سماجی صورت حال پر اس کا کیا اثر ہوا، ان امور کے حوالے سے مسلم زبانوں میں کوئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی۔ شبلی نے ''شعرالعجم'' کی چوتھی جلد میں ان امور کے مفصل اور تازہ جواب مہیا کیے۔ داعی گیلانی کا خیال ہے کہ جو شخص بھی ''شعرالعجم'' کا دقت نظر سے مطالعہ کرے گا اسے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ایران کے ادب منظوم کے ناتے کوئی کتاب اب تک ''شعرالعجم'' کی جامعیت کو نہیں پہنچی۔

داعی گیلانی، رومی پر شبلی کی تصنیف لطیف ''سوانح مولانا روم'' پر لکھتے ہوئے شبلی کی تازہ کاری اور کلامی مباحث کو پانی کر دینے کی صلاحیت کی داد دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں شبلی نے کتاب مذکور میں گہرے مسائل و مباحث کو اس قدر سادہ اور روشن اسلوب میں حل کر دیا ہے اور اس مہارت سے کہ گویا ہر بھید سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ ان حقائق و معارف کو اس قدر شیریں، جالب اور جاذب اسلوب میں سمو دیا ہے کہ میرا قلم اس کے بیان سے عاجز ہے۔ انھوں نے حیات رومی کا ایسا دروازہ کھول دیا اور گویا ایسے علمی رازوں کو فاش کر دیا جو اب تک ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔ اس خدمت پر شبلی درحقیقت ہمارے سپاس و قدردانی کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

آپ کے علم میں ہے کہ شبلی کا ''کلامیات'' کا سلسلہ ''الغزالی'' (۱۹۰۲ء) سے شروع ہوا۔ اور پھر ''علم الکلام'' اور ''الکلام'' سے ہوتا ہوا سوانح مولانا روم (۱۹۰۶ء) پر منتج ہوا۔ سوانح مولانا روم پر گفتگو ہو چکی، اب علم الکلام اور

الکلام پر داعی گیلانی کے تاثرات کا اجمالی ذکر کیا جاتا ہے: "علم الکلام" کے فارسی ترجمے "تاریخ علم کلام" کے دیباچے میں شبلی کی دین کا ذکر کرتے ہوئے داعی گیلانی لکھتے ہیں:

یہ فکر ایک عرصے سے ذہنوں میں راسخ ہو چکی ہے کہ علم کلام کے بیش تر مسائل یونانیوں سے ماخوذ و مقتبس ہیں اور مسلمان ندرت فکر اور اختراع سے عاری تھے۔ ان کے پاس جو کچھ تھا یونانی حکما سے فیض اندوزی کا نتیجہ تھا جیسا کہ بعض یورپی مصنف لکھتے ہیں کہ فلسفے کے میدان میں مسلمان ارسطو کے اور یونانیوں کے کاسہ لیس تھے۔ شبلی نے اس غلط فکری کا اپنے توانا قلم سے اس طرح رد کیا کہ قاری کے لیے شک و شبہہ کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ شبلی کی تحقیق بتاتی ہے کہ غزالی کے ہاں نبوت، وحی اور الہام وغیرہ جیسے مطالب فارابی اور ابن سینا سے ماخوذ ہیں۔ یہ مسائل ابن سینا اور فارابی کی مخترعات ہیں اور ان کا حکمائے یونان سے کوئی تعلق نہیں۔

غرض شبلی ایقان انگیز دلائل و براہین سے ثابت کرتے ہیں کہ الٰہیات کے میدان میں مسلمان یونانیوں سے میلوں آگے تھے۔ وہ یورپیوں کے اس لغو خیال کے جواب میں کہ مسلمان یونانی فکر کے نقال تھے، کیا خوب لکھتے ہیں کہ ان کو تاہ نظروں کو ابوالبرکات، امام غزالی، امام رازی، آمدی اور ابن تیمیہ کا مطالعہ کرنا چاہیے تا کہ انھیں معلوم ہو کہ فلسفہ تو ایک طرف مسلمانوں نے یونانی منطق کی غلطی اور بے اصلی کو بھی ثابت کیا جس کا کسی کو احتمال تک نہ تھا۔

علامہ شبلی کی دوسری کتاب "الکلام" کے ترجمے: "علم کلام جدید" کے مقدمے میں شبلی کو خراج محبت پیش کرتے ہوئے فخر داعی لکھتے ہیں کہ اس مردِ بزرگ (شبلی) کی ایک نمایاں خدمت جس پر وہ ہم سب کی ہر طرح کی توصیف کے مستحق ہیں، یہ ہے کہ ہمارے افکار کے گراں بہا گنجینوں یعنی ہمارے قدیم علمی مفاخر کو جو معاشرے کے علمی و عقلی زوال کے باعث اور آزادیِ اظہار کے فقدان کے باعث فرزندانِ ایران نے مخفی اور سربہ مہر چھوڑ دیے تھے اور ہماری نظروں سے اوجھل تھے، اس مرد کے توسط سے جمع ہو کر ہمارے ہاتھوں میں پہنچ گئے۔

فخر داعی گیلانی نے شبلی کی تصنیفات و تالیفات کی ارزش اور اہمیت کے بیان میں جرمنی کے کسی نامور مستشرق کا ذکر کیا ہے جس کا کہنا ہے کہ ہندوستان کے قلم کاروں میں شبلی وہ تنہا مصنف ہیں کہ ان کی تحریریں کلیۃً علمی بنیادوں پر استوار ہیں اور آج کے یورپی محققوں کی منقدانہ روش کے مطابق ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ فخر المحققین فخر داعی گیلانی نے شبلی سے عقیدت اور محبت کا حق اس طرح ادا کیا کہ اہل ایران کو شبلی کی وسعت علم، نکتہ طرازی، ابتکار فکر اور فارسی ادبیات کے ایک بے مثال ناقد کے طور پر متعارف کرایا۔ یہ ایک ایسی خدمت ہے جس کے نتیجے میں خود فاضل مترجم کا نام شبلی کے نام کے ساتھ ایک جزو لاینفک کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ ایک بلند نگاہ سالک نے کس قدر درست کہا تھا کہ ہم بیچاروں کی حیثیت تو شاہبازانہ طریقت کے پنجے سے چٹی ایک چیونٹی کی سی ہے۔ فلک رس اور ستارہ شکار پرواز تو شہباز کرتا ہے لیکن اس کے فیض سے ہمیں بھی بلندی نصیب ہو جاتی ہے۔ حق یہ ہے کہ فخر داعی گیلانی بھی شبلی کے سے شاہین بلند پرواز کے فیض سے ہمیشہ اوج آسمان پر نظر آتے رہیں گے اور اہل نظر سے خراج عقیدت وصول کرتے رہیں گے۔

حواشی:

۱۔ بحوالہ تاریخ تذکرہ ہای فارسی (احمد گلچینِ معانی)، کتابخانہ سنائی، ۱۳۴۳ھ۔ش، ص ۶۶۲

۲۔ ر۔ک دانشنامۂ ادب فارسی (مرتبہ حسن انوشہ)، وزارتِ فرہنگ وارشادِ اسلامی، ۱۳۷۵ھ ش، ص ۱۵۰۰

۳۔ ملاحظہ فرمائیں کاروانِ ہند، آستان قدس رضوی، بارِ اول ۱۳۶۹ھ ش، صص ۶۱۲، ۶۲، ۷۶۶، ۷۷۳، ۸۷۵، ۸۸۱، ۱۱۷۵

۴۔ ایضاً، ص ۶۶۲

۵۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ خود کتابِ مذکور میں شبلی کا نام "سراج الدین محمد" لکھا گیا ہے جو صریحاً غلط ہے۔ شبلی کے مختصر حیات نامے میں اور بھی اغلاط ہیں مگر ان کا ذکر سردست میرے موضوع سے خارج ہے۔

۶۔ ملاحظہ ہو کتاب مذکور، انتشاراتِ آگاہ ۱۳۵۸ھ ش، صص ۵۸، ۸۴، ۱۳۶، ۱۸۰، ۱۹۹، ۲۶۹، ۲۹۳، ۳۰۹

۷۔ فرہنگ فارسی معین (بخش سوم بہ سلسلہ اعلام) جلد ششم، تہران، ۱۳۸۲ھ ش میں دو کے بجائے تین جلدوں کا ذکر ہے۔

۸۔ فخر داعی گیلانی کے سوانح کی یہ تفصیل دانش نامۂ دانش گستر (تہران) جلد یازدہم ۱۳۸۹ھ ش اور دانش نامۂ ادب فارسی (حسن انوشہ)، جلد چہارم، تہران ۱۳۸۰ھ ش سے ماخوذ ہے۔

۹۔ یہ کتاب ۱۹۷۸ء میں لکھی گئی۔ اردو ترجمے کے لیے ملاحظہ ہو ایران اور مصر میں کتب سوزی (ترجمہ وحواشی عارف نوشاہی) ۱۹۸۱ء

۱۰۔ مقالاتِ شبلی (جلد ششم)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء، ص ۱۳۶

۱۱۔ کتابخانہ اسکندریہ، مطبع ارمغان، ۱۳۱۵ھ ش، ص ۴۸

۱۲۔ یہ وہی بمبئی ہے جس کے بارے میں شبلی کے یہ شعر بڑے مشہور ہیں: نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نورا ... بدہ ساقی مے باقی ... الخ اور جو شبلی کے اس مصرعے کی یاد بھی دلاتے ہیں: "این غزل اول فیضِ اثر بمبئی است"۔ اہل علم اور شبلی شناسوں کو یاد ہوگا کہ فارسی شعری مجموعے کا نام اولاً "دستۂ گل" نہیں "بمبئیات" تھا۔ رک "مکاتیب شبلی" اول، ص ۲۰۶

۱۳۔ اشارہ شاہِ ایران محمد علی شاہ کی طرف ہے جس نے تحریک آزادی کو دبانے کے لیے تبریز اور آذربائیجان کے حریت پسندوں کا خون بہایا۔

۱۴۔ متنبی کا مشہور شعر یاد آتا ہے: اعزُّ مکانٍ فی الدُّنی سرجُ سابحٍ۔ وخیرُ جلیسٍ فی الزمانِ کتابٌ

۱۵۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۸

۱۶۔ اشارہ شبلی کے حادثۂ گزندِ پا (۱۹۰۷ء) کی طرف ہے جس پر انھوں نے ایک یادگار شعر کہا تھا:

شبلی نامہ سیاہ را بہ جزائے عملش پا بریدند و صدا خاست کہ سر بایست!

۱۷۔ شعر العجم (جلد اول)، تہران، دنیائے کتاب ۱۳۶۳ھ ش، ص ھ

۱۸۔ شعر العجم کی تیسری جلد کا ترجمہ سرور خاں گویا اعتمادی نے کیا تھا۔ باقی جلدوں میں سے پہلی اور پانچویں کا ترجمہ منصور انصاری نے، دوسری کا گل محمد خان زکریا نے اور چوتھی کا برہان الدین کشکلی نے ترجمہ کیا۔ میری نظر سے یہ تراجم نہیں گزرے۔ ان معلومات کے ضمن میں میرا ماخذ احمد گلچین معانی کی کتاب "تاریخ تذکرہ ہای فارسی" ہے۔

۱۹۔ شعر العجم (جلد سوم)، تہران، دنیائے کتاب ۱۳۶۳ھ ش، ص ھ

مولانا شبلی نعمانیؒ کی سیاسی بصیرت

ڈاکٹر سعادت سعید

ABSTRACT:

Allama Shibli Naumani was a great literary and religious scholar. He like Sir Sayyed Ahmad Khan, Altaf Hussain Hali and Allama Muhammad Iqbal guided Indian Muslims during tyrannical period of British Empire in India. In spite of his rigid and traditional religious concepts he was of the opinion that if Muslims want to compete with global powers of their age they have to embrace the concepts of Western materialistic sciences. In this context readers could easily appreciate his enlightened approach towards the progress of culture and civilization at large.

کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ غالب نے جب اسیری میں آتش زیر پا ہونے کی بات کی تھی تو کیا اس کا منشا آزادی کا حصول نہیں تھا۔ ملی یا قومی آزادی نہ سہی انفرادی آزادی کا وجودی بوجھ اس کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ اس آزادی کا ۱۸۰۳ء میں جنرل لیک کی فتح دلی سے کوئی تھا یا نہیں تھا لیکن غالب کا زمانہ کٹھ پتلی مسلم حکمرانوں کا زمانہ تھا۔ اقتدار عملاً ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں تھا۔ ایسے میں اگر اس نے کعبہ میرے پیچھے کا نعرہ بلند کیا تھا اور کلیسا کو آگے دیکھا تھا تو یہ اس کی فکری بصیرت کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ اس دور سے آج تک کلیسا کے آگے ہونے کا سلسلہ عروج در عروج گلوبلائزیشن کے معرکہ آرا دور کا نقیب بن چکا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے اپنے مقالے ''غیر قوموں کی مشابہت'' میں اس بات کو بالتصریح واضح کیا ہے کہ مسلم تاریخ میں غیر قوموں سے علم و ہنر کے حصول سے لے کر ثقافتی لین دین تک بہت کچھ لینے کی اسناد موجود ہیں۔ اس لیے انگریزی دور میں جو مسلمان غیر قومی ثقافت سے گریز پائی کے اطوار اپنائے ہوئے ہیں انھیں اسلامی تاریخ میں دیگر قوموں کے رسوم و رواج اور اطوار کو اختیار کرنے کی لاتعداد مثالیں ملیں گی۔ سو اگر سر سید احمد کی چھری کانٹا ثقافت اور علامہ اقبال کی بو ٹائی تہذیب اور قائداعظم محمد علی جناح کے انگریزی طور طریقگی کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اسے جان لینا چاہیے کہ علامہ شبلی نعمانی نے اس نوع کی ظاہر داری کو اختیار کرنے کے حق میں بے شمار دلائل دیے ہیں۔

شبلی اپنے مضمون ''غیر قوموں کی مشابہت'' کا آغاز یوں کرتے ہیں:

''ہماری قوم میں نئے علوم وفنون اور نئے تمدن اور شائستگی کے نہ پھیلنے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ بہت سے مسلمانوں کا اب تک خیال ہے کہ ہم کو غیر قوموں کا تشبہ شرعاً ناجائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک قوم کے مقدس حضرات یورپین علوم وفنون، یورپین زبان، یورپین تمدن، یورپین طرز معاشرت سے جہاں تک ہوسکتا ہے اجتناب کرتے ہیں اور بہ ضرورت کوئی بات اختیار کرنی پڑتی ہے تو ان کا دل ان کو ملامت کرتا رہتا ہے۔''[۱]

ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے پہلے مقامی ہندی مسلمانوں نے اپنے پرکھوں کے علوم وفنون، زبان، تمدن، اور طرز معاشرت کو اپنانے میں کبھی عار محسوس نہ کی۔ چاہے اس عمل میں کئی مقدس حضرات نے ملامتیں ہی کیوں نہ کی ہوں۔ مسلم دنیا ملامت در ملامت کئی ملامتی سلسلوں سے گزر کر جدید یورپین علوم وفنون، یورپین زبان، یورپین تمدن، یورپین طرز معاشرت کو اختیار کرنے کے سلاسل پر بالاختیار یا بالجبر عمل پیرا ہے۔ یوں ابن الوقتیوں سے لے کر صاحب بہادروں تک ہماری تہذیب نے ثقافتی آمیزوں کی نشو ونما اور فروغ کے در کھلے رکھے ہوئے ہیں۔ کئی دانش وروں نے اس دور میں از سرِنو شبلی نعمانی والی منطق کو قبول کرتے ہوئے اس منطق کا اعادہ کیا ہے کہ عالمی منڈی کی چکا چوند اور نو بہ نو اشیا سازی پر رشک تو بہت ہے لیکن وہ اس اہلیت سے محروم ہیں کہ خود اس منڈی میں داخل ہو سکیں۔ ان کا پیچھے رہ جانا اس لیے کھلتا ہے کہ وہ مقابلے کی نئی دوڑ کو دور ہی سے دیکھ کر اپنے ردِّعمل کا اظہار کر رہے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے اپنی کتاب الکلام (حصہ دوم) میں واضح طور پر یہ بحث کی ہے کہ'' اسلام تمدن اور ترقی کا مانع نہیں بل کہ موید ہے۔''[۲] ان کے خیال میں ترقی دشمنی کی باتیں اسلام میں موجود نہیں ہیں اس لیے تمدن کی ترقی کے سب اصول اسلام میں پائے جاتے ہیں۔ بقول علامہ اقبال:

یہ کاروان ہستی ہے تیز گام ایسا
قومیں کچل گئیں ہیں جس کی روا روی میں

سر سید احمد خان اور شبلی نعمانی کے مذہبی اور ثقافتی اختلافات جتنے بھی سنگین کیوں نہ ہوں۔ دونوں مسلمانوں کی تہذیبی اور مادی ترقی کے لیے یورپین علوم وفنون، یورپین زبان، یورپین تمدن، یورپین طرز معاشرت وغیرہ کو آئیڈیل قرار دے چکے ہیں۔ علاوہ ازیں دونوں مفکروں نے انگریزوں کی وفاداری میں ہندی مسلمانوں کی ترقی کا راز مضمر پایا۔

علامہ شبلی نعمانی برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں کے ایک بڑے محسن تھے۔ انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی غلامی کے دور عروج کو اپنے شعور کی آنکھ سے دیکھا۔ یہ دور اسلامیان ہند کی مایوسی اور کس مپرسی کا دور تھا۔ اس زوالی عہد میں انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے جن شخصیات نے اپنا کردار ادا کیا ان کو رفقائے سر سید کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ سر سید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی اور عبدالحلیم شرر جیسے عظیم لوگوں نے مغلوب مسلم معاشرے کو اپنی مصلحانہ دانش سے ایک ایسی ڈگر پر لا کھڑا کیا کہ جس سے آگے آزادی اور حمیت کے سلاسل اس کے منتظر تھے۔ سر سید کی انگریز دوستی کو حوالہ بنا کر جدید دور کی منطق کے لبادوں میں لپٹے دانش وروں کے لیے انہیں ٹوڈی قرار دینا شاید کچھ ایسا مشکل نہ ہو اور اس حوالے

سے اکبرالہ آبادی کے فیضانِ نظر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تاہم اس عہد نا پرساں میں اگر مسلمان اپنی ترقی کے لیے چوکس ہوئے تھے تو اس عمل کو سرسید احمد خان جیسے عظیم قائدین کے ویژن کا نتیجہ قرار دینا اچنبھے کی بات نہیں۔

اس دور کی مصلحتوں نے ہمارے ملی قائدین کو مصالحت کی منطق کو قبول کرنے پر آمادہ کیا۔مصالحت اور بغاوت کے مابین موجود جدلیاتی نزاع کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستانی معاشرے پر صدیوں سے غالب مسلمان انگریزوں کے ہاتھوں اپنی مغلوبیت کی حدود کی شناخت کرتے ہوئے اپنا استقبالی لائحہ عمل مرتب کرتے۔اس حوالے سے جہاں ہمارے مذکورہ اکابرین نے مسلم ماضی کی ان مول دانش کو از سرِ نو دریافت کرنے کا جتن کیا وہاں نئی نسل کو یہ بھی باور کرایا کہ تقلید اور نقل کی روش کسی معاشرے کے انجماد کی ولالت تو ہو سکتی ہے اس کی اندرونی حرکتوں کے لیے تغیر، ارتقا، جدت اور اجتہاد کے اصولوں سے آشنائی امر لازم ہے۔چلو تم ادھر کو ہوا جدھر کی ہو! اس قسم کا نعرہ مغلوب معاشروں کے ٹھہرے ہوئے فکر و فلسفہ کی جھیلوں میں ارتعاش پیدا کر دیا کرتا ہے۔۱۸۵۷ء میں بے بنیاد ہونے والے ہندی مسلمانوں نے کم از کم نصف صدی تک اپنے پاؤں مضبوطی سے رکھنے کے لیے جب مناسب زمین کا بندوبست کر لیا تو غلامی کی زنجیروں کو توڑنے والی علامہ اقبال کی موثر شاعری نے انھیں آزادیِ کامل کے خواب دیکھنے پر مائل کیا۔یہ خواب سرسید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی اور عبدالحلیم شرر جیسے ادیبوں اور شاعروں کے لیے کارِ محال کے زمرے میں آتے تھے تاہم انھوں مسلم ماضی کی عظمتوں کی یاد دہانی سے ہندی مسلمانوں کو ایک مثبت پیغام سے آشنا کیا۔

علامہ شبلی نعمانی ایک جید محقق، مورخ، سوانح نگار، شاعر، ادبی مورخ، فقیہ، متکلم، نقاد اور مذہبی سکالر تھے۔انھوں نے اپنی تحقیقی بصیرتوں کو ا۔الفاروق ۲۔سوانح مولانا روم ۳۔علم الکلام) شبلی(۴۔المامون ۵۔موازنہ دبیر و انیس (۶۔شعرالعجم ۷۔مقالاتِ شبلی ۸۔سیرت النعمان ۹۔سیرت النبی) کتاب(، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۱۔الغزالی جیسی کتابوں میں انتہائی معتدل خوش سلیقگی سے استعمال کیا۔ان کی سیرت وسوانح پر لکھی گئی کتابوں سے اندازہ کیا جا سکتا کہ سیرت وسوانح لکھتے ہوئے سیرت نویس اور سوانح نگار کو کسی نوع کی جانب داری سے کام نہیں لینا چاہیے۔ان کے سامنے تاریخی اور شخصی حوالوں سے جو بھی تحقیقی سچائیاں سامنے آتی ہیں ان سے کسی بھی صورت بے نیازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔

شیخ اکرام نے اپنی کتاب شبلی نامہ کے تعارفی مضمون "جدید سیرت نگاری" میں رقم طراز ہیں:

> "سیرت نگاری کی نسبت علامہ شبلی مرحوم کا نقطۂ نظر عام مشرقی تذکرہ نویسوں کے زاویہ نگاہ سے بالکل مختلف تھا۔ان کی رائے تھی کہ سیرت نگار کو صاحبِ سیرت کی زندگی کا ہر پہلو دکھانا چاہیے، سیاہ بھی سفید بھی روشن بھی اور تاریک بھی وہ ان لوگوں کے مخالف تھے جو کسی کے "معایب دکھانے کو تنگ خیالی اور بدطینتی" سمجھتے ہیں اور کہتے تھے کہ "اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں" ۳

شبلی نعمانی کے اسی آزاد خیال نقطۂ نظر نے شاید استادِ محترم ڈاکٹر وحید قریشی کو یہ حوصلہ بخشا کہ وہ شبلی کی حیات

معاشقہ جیسی کتاب لکھ پائے جس کے بارے میں بہت سے مشرقی ذہنوں کو چند ریزرویشنز ہیں۔ یہ ریزرویشنز ان کے دماغوں میں موجود مشرقی ثقافتی اقدار کی پاس داری کے تصورات سے نسبت رکھتی ہیں۔ اگر علامہ شبلی زندہ ہوتے اور وہ اپنے بارے میں عطیہ بیگم کے روزنامچہ کو پڑھ لیتے تو شاید وہ سیرت و سوانح نگاری کے بارے میں اپنے یوروپی روشن خیالی کے تصورات پر نظر ثانی کا عندیہ ضرور دے دیتے۔ اس جملہ معترضہ کے بعد علامہ شبلی کی عظمت کو جاننے کے لیے شیخ اکرام کی موج کوثر میں موجود اس اقتباس کی جانب رجوع کرتے ہیں:

"شبلی ایسی بوقلمونی کہاں سے آئے گی؟ جو رندوں میں رند تھے، زہاد میں زاہد، نثاروں میں نثار، شعرا میں شاعر، معلموں میں معلم، مورخوں میں مورخ، سیاستدانوں میں سیاسی، اردو میں عشقیہ خطوط کے بانی، تعلیم میں نئی روش کے آموزگار، اور علمی تصنیف وتالیف کے میدان میں ہماری زبان کے سب سے بانکے شہسوار! قلیل مدت حیات اور کمزور صحت کے باوجود شبلی نے جو کچھ کر دکھایا کیا وہ ایک معجزہ سے کم ہے؟

وہیرم، شاعرم، رندم، ندیم شیوہ ہا دارم
گرفتم رحم بر فریاد و افغانم نمی آید" [۴]

علامہ محمد اقبال بھی کئی پہلوؤں سے شبلی نعمانی کے تبحر علمی کے مداح تھے۔ انھوں نے خود اسلام میں اجتہاد کی گنجائش کو ثابت کیا ہے۔ اپنے اسی حوالے کی روشنی میں وہ سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔۔ اگر مولانا شبلیؒ زندہ ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ حالات میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا" [۵]

مضمون کے آغاز میں علامہ شبلی نعمانی کی مصلحت کوشی اور مصالحت جوئی کا جو تذکرہ کیا گیا تھا اس کی بنیاد ان کے دو مضمونوں میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ مقالات شبلی جلد اول کے ان مضامین کے عناوین ہیں ا۔ مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیونکر رہنا چاہیے ۲۔ غیر قوموں کی مشابہت۔ پہلے مضمون میں شبلی نعمانی نے یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کے مال وحکومت پر جب کوئی غیر مذہب کی قوم قبضہ کر لیتی ہے (یعنی اگر انگریز ہندوستان پر قابض ہو چکے ہیں۔ یا اب ہندوستان پر ہندوؤں کی حکومت ہے) تو ان کا فرض ہے کہ وہ اس کی اطاعت کرے۔ یوں سر سید کا نقطہ نظر حدیث، فقہ اور تاریخ کے آئینے میں سلجھایا گیا ہے۔ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"اس مسئلہ کے متعلق اصل میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی غیر مذہب حکومت مسلمانوں کے ملک اور زمین پر قابض ہو جائے تو ا۔ یہ قبضہ حقیقی ہوتا ہے یا غاصبانہ ۲۔ مسلمانوں کو حکومت کی اطاعت فرض ہوتی ہے یا نہیں؟ فقہ میں اس کا ایک مستقل باب ہے جس کی سرخی یہ ہے باب استیلا الکفار، اس کے ذیل میں یہ حکم ہے (ترجمہ) اگر غیر مذہب والے ہمارے مال پر غالب آجائیں اور اس کو اپنے گھر میں جمع کریں تو وہ اس کے مالک ہوں

گے وجب علینا اتباعھم اور ہم پر ان کی اطاعت فرض ہوگی۔ ۶

اس مسئلے پر انھوں نے قرآن اور احادیث کے حوالوں سے بھی دلیلیں دی ہیں۔ تاریخی حوالوں سے انھوں نے ہجرت مدینہ کو بنیاد بنا کر کہا کہ مکے میں رہ جانے والے مال پر کفار کے قبضے کو روا جانا۔ اسی لیے بقول شبلی مہاجرین کو خدا کی جانب سے للفقراء المھاجرین کہا گیا ہے۔ نجاشی نے مسلمانوں کو پناہ دی تو مسلمان نجاشی کے خلاف ہونے والی جنگ میں اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''اسلام کی تاریخ میں اکثر غیر قومیں اسلامی ملکوں پر قابض ہو گئیں۔ اس وقت ہزاروں فقہا اور علما موجود تھے۔ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ ان کے متعلق فقہی احکام مرتب نہ کرتے۔'' ۷

علامہ شبلی نعمانی نے اس تناظر میں تاتاریوں کے ایران اور عراق پر قبضے کے پس منظر میں دار الحرب اور دار الاسلام کی بحث کی ہے اور کہا ہے کہ جب تک اسلامی احکام یعنی نماز روزہ وغیرہ جاری ہیں اس وقت تک دار الاسلام باقی رہے گا اور مسلمانوں کی وہی حالت ہوگی جو اسلامی ملک میں ہوتی ہے۔'' ۸

علامہ شبلی کی انگریز دوستی کے حوالے سے زیرِ نظر مقالے میں یہ رائے بھی موجود ہے:

''غور کرو فقہا نے تاتاریوں کے زمانے میں یہ فتویٰ دیا جو بت پرست تھے۔ اور جن کو مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی مناسبت نہ تھی۔ آج جب کہ عیسائی حکومت ہے، جو اہل کتاب ہیں۔ مسلمانوں کے فرائض مذہبی میں کوئی تعرض نہیں کیا جاتا۔ مسلمان خود عیسائی مذہب کا زور و شور سے سر بازار رد کرتے ہیں تو ایسی حالت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ حکومت کی وہی پوزیشن ہو گی جو اکبر و جہانگیر کے زمانہ میں تھی اور فقہا کا یہ حکم واجب العمل ہوگا کہ 'وجب علینا اتباعھم'۔'' ۹

یہاں شبلی نے تیموری کا لفظ زبانی باتوں کے حوالے سے استعمال کرتے ہوئے کہا ہے:

''یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ محض تیموری یعنی زبانی باتیں تھیں۔'' ۱۰

علامہ شبلی نے کئی تاریخی واقعات سے اپنے انگریز دوست نظریے کو مستند بنایا ہے۔ سسلی میں مسلمانوں کی راجرز سے وفاداری، بغداد میں ہلاکو خاں سے مسلمانوں (رشید الدین، علاء الدین جوینی، خواجہ شمس الدین، محقق طوسی، وغیرہ) کی قربت کا تذکرہ بھی شبلی کے استدلال کو مستحکم کرتا ہے۔ اس مضمون کا اختتام وہ ان الفاظ سے کرتے ہیں:

''واقعات مذکورہ بالا سے تم کو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد زریں سے لے کر آج تک مسلمانوں کا ہمیشہ یہ شعار رہا ہے کہ وہ جس حکومت کے زیر اثر رہتے ہیں اس کے وفادار اور اطاعت گزار رہتے ہیں۔ یہ صرف ان کا طرز عمل نہ تھا بلکہ ان کے مذہب کی تعلیم تھی جو قرآن مجید، حدیث، فقہ میں کنایۃً اور صراحۃً مذکور ہے۔'' ۱۱

علامہ شبلی کے عالمانہ مرتبے کو علامہ اقبال کی جانب سے تسلیم کیا جانا کوئی معمولی بات نہیں۔ اسے علامہ شبلی کے تحقیقی و تاریخی شعور کا ثمرہ سمجھنا چاہیے۔ حالی اور شبلی کی وفات پر علامہ اقبال نے ایک نظم لکھی تھی جس کے چند

اشعار پیش خدمت ہیں:

شبلی و حالی

مسلم سے ایک روز یہ اقبال نے کہا
دیوانِ جزو و کل میں ہے تیرا وجود فرد
تیرے سرودِ رفتہ کے نغمے علومِ نو
تہذیب تیرے قافلہ ہائے کہن کی گرد
پتھر ہے اس کے واسطے موجِ نسیم بھی
نازک بہت ہے آئنہ آبروئے مرد
مردانِ کار ڈھونڈ کے اسبابِ حادثات
کرتے ہیں چارۂ ستمِ چرخِ لاجورد
پوچھ ان سے جو چمن کے ہیں دیرینہ رازدار
کیونکر ہوئی خزاں ترے گلشن سے ہم نبرد
مسلم مرے کلام سے بے تاب ہو گیا
غماز ہو گئی غمِ پنہاں کی آہ سرد
کہنے لگا کہ دیکھ تو کیفیتِ خزاں
اوراق ہو گئے شجرِ زندگی کے زرد
خاموش ہو گئے چمنستاں کے رازدار
سرمایہ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں
حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد
اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟

علامہ شبلی نعمانی اور الطاف حسین حالی دردمند دل رکھنے والے انسان تھے۔ وہ چمنستانِ اسلام کے راز دار تھے۔ شبلی نعمانی کے ان اشعار سے ہمیں ان کے بارے میں علامہ اقبال کی شعری رائے کہ گہرائی کا اندازہ ہوسکتا ہے

جنگ بلقان کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

یہ جوش انگیزیِ طوفان بیداد و بلا تا کی
یہ لطف اندوزیِ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانا ہے
ہماری گردنوں پر ہو گا اس کا امتحاں کب تک
کہاں تک لو گے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

علامہ شبلی نعمانی کے یہ اشعار بھی ان کے دردمند دل کے غماز ہیں:

پہنائی جارہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں
یہ زیور ''سید سجاد'' عالی کی وراثت ہے
یہی دس بیس اگر ہیں کشتگانِ خنجر اندازی
تو مجھ کو سستی بازوئے قاتل کی شکایت ہے
شہیدانِ وفا کے قطرہ خوں کام آئیں گے
عروسِ مسجدِ زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سوجانے کی عادت ہے

ان اشعار میں صلیبی جنگوں اور جہاد کے حوالے سے جو کچھ کہا گیا ہے اس میں حکومت کی اطاعت اور غیر ملکی تہذیبی اطوار اپنانے کے حوالے سے علامہ شبلی کے خیالات کی نفی تو نہیں ہوئی! ہنوز یہ سوال تشنہ جواب ہے! بہر حال علامہ اقبال نے ان دونوں نظریات کی جا بجا اپنے شعری ونثری افکار کے حوالوں سے تردید کی ہے:

از غلامی دل بمیرد در بدن
از غلامی روح گردد بار تن

تو غیر مذہبی حکومت کی غلامی کم از کم اقبال کے لیے ناقابل قبول تھی:

چھوڑ یورپ کے لیے رقصِ بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضربِ کلیم اللّٰہی!

تو کیا اقبال یورپی ثقافت اور تہذیب کو اختیار کرنے کا درس دے رہے ہیں؟ ظاہر ہے ایسا نہیں ہے تو پھر شبلی نعمانی کے خیالات کو مسلمانوں کو انگریزی دور میں بیل آوٹ کروانے کا شاخسانہ قرار نہیں دیا جائے گا! گلوبلائزیشن کے فیض و برکات اگر غلام سازی اور صارفیت کی راہیں ہموار کر رہی ہیں تو ہمیں ایک لمحے کے لیے اپنے بزرگوں کی

عظمتوں کو ان کے مخصوص حالات کے پس منظر میں سراہنا ہو گا صلیبی جنگوں کے تسلسل کو (بلقان) ترکی سے باہر آ کر بھی دیکھنا ہوگا۔ اس حوالے سے ہندوستان، افغانستان، عراق اور دیگر کئی علاقوں پر مغربی قبضوں کو تاریخی تناظر میں نئی معنویتوں سے ہم کنار کیا جاسکتا ہے۔ اپنی تمام تر پذیرائی کے باوجود علامہ شبلی نعمانی شکوہ روزگار کرنے کا حق رکھتے تھے۔ وہ عبدالباری ندوی اسسٹنٹ پروفیسر دکن کالج پونہ کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:''بھائی میں تو اب چراغ سحر ہو رہا ہوں تم لوگ اب اپنی ذمہ داری کو محسوس کرو۔ اپنے عیوب کو سب سے بہتر جانتا ہوں۔ المراء عرف بنفسہ لیکن علمی صحیح مذاق کا پھیلانا اپنا کام سمجھتا رہا اگر اس میں ذرا بھی کامیابی ہوئی تو مسلم گزٹ کے مصنوعی معایب تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔ سخت افسوس یہ ہے کہ ہر حیثیت سے زمانہ میں خر بازاری بڑھ گئی ہے، نیک و بد کی تمیز مطلق نہیں۔'' (۱۲)

حوالے:

۱۔ مولانا شبلی نعمانی، مقالات شبلی، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۳۷ء، ص ۱۶۵
۲۔ مولانا شبلی نعمانی، الکلام (حصہ دوم) عمدۃ المطابع، لکھنؤ، ۱۹۰۶ء، ص ۲۱۸ تا ۲۲۳
۳۔ شیخ محمد اکرام، شبلی نامہ، تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی، ص ۵
۴۔ ایضاً
۵۔ خط بنام سید سلیمان ندوی، ۱۹۲۶ء، ص ۱۴۲
۶۔ مولانا شبلی نعمانی، مقالات شبلی (جلد اول) مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء، ص ۱۶۵
۷۔ ایضاً، ص ۱۶۷
۸۔ ایضاً، ص ۱۶۸
۹۔ ایضاً، ص ۱۶۹
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۷۰
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۷۱
۱۲۔ مولانا شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی، حصہ دوم، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۱۷ء، ص ۱۸۴۔۱۸۵

موازنہ انیس و دبیر کا قضیہ

ڈاکٹر انیس اشفاق

ABSTRACT:

Moawazna-e-Anees-o-Dabeer **is, undoubtedly, one of the most influential and well-debated books of Urdu. This article reads all the criticism lattar on maked on the work. This article strives the conclusion that Dabir was never such a Pigmy as has been drawn in comparison with Anees. Dabir as a poet, had to suffer a lot due to this book criticism.**

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اپنی تمام تصنیفوں میں شبلی کو سب سے زیادہ شہرت موازنہ لکھ کر حاصل ہوئی اور اسی کے ساتھ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ یہ شہرت انہیں دبیر پرستوں کی نہ تھمنے والی اس مہم سے ملی جو موازنے کی اشاعت کے فوراً بعد اس کے خلاف شروع ہوگئی تھی۔ شبلی کی اس کتاب سے پیدا ہونے والے اس تاثر نے کہ یہ دراصل انیس کے مقابل دبیر کو سبک کرنے کا ایک جارحانہ عمل ہے محبان دبیر کو مشتعل کردیا اور وہ چنگاری جو عبدالغفور نساخ نے انتخابِ نقص کی شکل میں چھوڑی تھی، لکھنؤ کی زمین پر انگارے کی طرح دہک اٹھی اور موازنے کے خلاف تحریروں کی ایک باڑھ سی آ گئی۔ اس مخالفت کا اصل اور منطقی سبب یہ تھا کہ شبلی نے اپنی کتاب کا عنوان موازنہ رکھنے کے باوجود دونوں شاعروں کا تقابل کرتے وقت موازنے کے بنیادی مطالبے یعنی دونوں شاعروں کے یکساں مقدارِ کلام کا لحاظ نہیں رکھا۔ اسی یکطرفہ عمل کی بنا پر اُن پر حد سے بڑھی ہوئی انیس پرستی کا الزام لگا کر انہیں جنبہ داری کے کٹہرے میں کھڑا کردیا گیا اور اس وقت سے آج تک شبلی کو دبیر کُشی کے اس سنگین الزام سے آزاد نہیں کیا گیا۔

بیسویں صدی کے اس بڑے ادبی قضیے پر قلم اٹھاتے وقت اُس ماحول کا ایک مرقع پیش کرنا ضروری ہے جو انیس و دبیر کے آمنے سامنے آنے کے بعد لکھنؤ کی گرم ہوتی ہوئی زمین پر تیار ہو رہا تھا:

''چونکہ انیس و دبیر ایک ہی آسمان کے دو ستارے تھے اس لئے طرفین ایک دوسرے کو اپنے

اپنے کمالات کی ضو دکھاتے اور مرثیوں میں خوشنما چوٹیں کر جاتے تھے۔ اس شاعرانہ نوک جھونک کا یہ اثر پیدا ہوا کہ ایک دوسرے کے ہوا خواہ آپس میں کچھ اور ہی انداز برتنے لگے۔ ایک جماعت انیسی ہونے پر فخر کرنے لگی تو دوسری دبیری ہونے پر نازاں ہوئی۔ یہ دونوں جماعتیں ہر وقت خانہ جنگی پر تلی رہتی تھیں۔" (۱)

ایسے حساس اور مجادلانہ ماحول میں کوئی بھی ایسی کتاب لکھتا اور شبلی ہی کا سا طریقہ کار اختیار کرتا تو اسی طرح کی ہلچل اور گرما گرمی پیدا ہوتی۔ درج بالا اقتباس میں کھینچی ہوئی تصویر کے مطابق میدانِ مرثیہ میں طرفین کے اترنے کے بعد انیسیوں اور دبیریوں کی صفیں آراستہ ہونے لگی تھیں اور کسی ایک طرف کا علم اونچا ہونے پر دوسری طرف کی صف اپنا علم اس سے زیادہ اونچا کرتی اور معرکہ شروع ہو جاتا۔ گویا ایک کو دوسرے سے بڑا بتانے جانے کا یہ متحاربانہ عمل لکھنؤ میں بہت پہلے سے شروع ہو گیا تھا۔ ایک دوسرے سے نبرد آزما ان دونوں گروہوں کی تربیت اگرچہ لکھنؤ کی زباں ساز ادبی فضا میں ہوئی تھی اور یہ دونوں گروہ ادبی اور لسانی امور سے اچھی طرح آگاہ تھے لیکن انیس و دبیر کے شاعرانہ مرتبے کے معاملے میں یہ اپنی طرفداریوں سے اوپر نہ اٹھ سکے۔

پروفیسر نیر مسعود نے اپنی انتہائی عمدہ کتاب "معرکۂ انیس و دبیر" میں اس معرکے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے اس کے عالمانہ اور جارحانہ دونوں رخوں کو بخوبی نمایاں کیا ہے۔ ان معرکوں میں ایک طرف شخص پرستی کے جوش میں سرِ مجلس گریبانوں پر ہاتھ ڈال دیے جاتے اور دوسری طرف دونوں شاعروں کے مابین ایک سے مضامین کی ادائی میں جوابی کلاموں کے ذریعے ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی سعی کی جاتی تھی۔ صف بندیوں اور محاذ آرائیوں کے اس ماحول میں جب شبلی کا موازنہ سامنے آیا اور جب اس میں دبیر کے بہت کم کلام کو بنیاد بنا کر بہت سخت لہجے میں دبیر کو نشانہ بنایا گیا تو سب کے سب دبیر پرست بھڑک اٹھے اور موازنے کا منھ توڑ جواب دینے کے لئے ہتھیار بند ہو کر میدان میں نکل آئے اور شبلی کی گھیرا بندی شروع کردی۔ ہماری ادبی تاریخ میں شاید ہی کوئی کتاب اپنی اشاعت کے بعد اتنے شدید ادبی تنازعے کا شکار ہوئی ہو اور مضمونوں اور کتابوں کی شکل میں شاید ہی کسی کتاب کے اتنے جوابات لکھے گئے ہوں۔

سوال یہ ہے کہ ایسا شبلی ہی کے ساتھ کیوں ہوا۔ شبلی سے قبل آزاد اور حالی بھی اپنی کتابوں میں صنفِ مرثیہ پر خامہ فرسائی کر چکے تھے۔ آزاد نے آبِ حیات میں دونوں شاعروں کے ذکر میں موازنے کا سا انداز اختیار کیا لیکن بہ کمال ہوشیاری اس انداز میں خود کو شامل کرنے کے بجائے مقابلوں والے بیانات انیسیوں اور دبیریوں کے مکالموں کے ذریعے دلوا دیے۔ لیکن ایک جگہ وہ انیس کے بارے میں ایسی باتیں کہہ گئے جن کی تہہ میں دبیر دب سے گئے۔ یہ بیان ملاحظہ ہو:

"مگر اتنا یہاں بھی کہتا ہوں کہ میر انیس صاحب صفائی کلام، لطفِ زبان، چاشنی محاورہ، خوبیِ بندش، حسنِ اسلوب، مناسبت مقام، طرزِ ادا اور سلسلے کی ترتیب میں جواب نہیں رکھتے۔" (۲)

اس بیان کو غور سے پڑھئے اور دیکھئے کہ شاعری کی ایسی کون سی خوبی ہے جو آزاد نے انیس میں نہ بتائی ہو۔

انہوں نے فصاحت اور بلاغت کا ذکر تو نہیں کیا مگر وہ خوبیاں (مناسبتِ مقام، صفائیِ کلام، سلسلے کی ترتیب) بتادیں جوان اصطلاحوں سے مخصوص ہیں اور دبیر کے سلسلے میں آزاد نے وہی باتیں کہی ہیں جو عام طور پر کہی جاتی رہی ہیں۔ یعنی شوکتِ الفاظ، مضامین کی آمد، غم انگیز اشارے، المناک اور دلگداز انداز۔ لیکن یہ اوصاف دبیر کے برابر نہیں لاتے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انیس و دبیر کے بارے میں آزاد کی نقل کی ہوئی باتوں کے جواب میں ساڑھے پانچ ہزار الفاظ پر مشتمل ''تنقیدِ آبِ حیات'' کے نام سے میر محمد رضا ظہیر کی جو کتاب سامنے آئی اس میں آزاد کو مخالفِ دبیر بتاتے ہوئے ان کی واقعاتی لغزشوں کا جواب تو دیا گیا لیکن آزاد نے جس ذہانت و ذکاوت کے ساتھ انیس کو دبیر سے آگے بڑھا دیا تھا اس پر کوئی اظہارِ خیال نہیں کیا گیا۔

اور حالی نے تو غضب یہ کیا کہ مرثیے کے پورے بیان میں صرف ایک جگہ آتش سے منسوب روایت کے حوالے سے دبیر کا ذکر کیا اور بس۔ صنفِ مرثیہ سے متعلق بارہ صفحوں کی عبارت میں حالی نے انہیں دو حرف بھی دبیر پر صرف نہیں کیے لیکن ستم یہ کیا کہ دبیر کا نام لیے بغیر انیس کی زبان اور طرزِ بیان کی خوشہ چینی کے اس الزام کو بالکل بجا قرار دے دیا جو دبیریوں کو سب سے زیادہ مشتعل کرتا تھا۔ یہ بیان دیکھیے:

''انہوں نے اپنے کلام میں جابجا اس بات کا اشارہ کیا ہے اور بالکل بجا کیا ہے کہ ان کے ہم عصر مرثیہ گو ان کی زبان اور طرزِ بیان کے خوشہ چیں تھے۔''

اور اس بیان کے ثبوت میں یہ دو شعر نقل کیے ہیں:

نہریں رواں ہیں فیضِ شہِ مشرقین کی
پیاسوں پہ سبیل ہے ذکرِ حسین کی
لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

اور اس کے بعد انیس اور صرف انیس کی توصیف کرتے چلے گئے اور آخر انیس ہی کے مرثیے کو مثالی مرثیہ قرار دیا۔

کلامِ انیس سے ہم عصر مرثیہ گویوں (جن میں سب سے نمایاں دبیر تھے) کے فیض اٹھانے کے الزام کو حالی کا بجا قرار دینا اور دبیر کو مرثیے کے ذکر میں سرے سے نظر انداز کر دینا دبیر پرستوں پر ایک بڑا حملہ تھا لیکن حیرت ہے کہ اس پر دبیریوں کا متوقع ردِ عمل سامنے نہیں آیا۔ لیکن موازنے کے منظرِ عام پر آتے ہی گروہ بند دبیریوں کی جانب سے ایک کے بعد ایک کتابیں آتی چلی گئیں اور یہ سب کی سب کتابیں یا تحریریں دو سو پچاسی (285) صفحات کو محیط شبلی کی پوری کتاب کے بجائے اُن انیس (19) صفحات کے جواب میں لکھی گئیں جو شبلی نے ''میر انیس اور مرزا دبیر کا موازنہ'' کے عنوان سے لکھے ہیں اور جن میں کلامِ دبیر کے معائب کو بیان کیا گیا ہے۔ موازنے سے عام قاری کا یہ تاثر قبول کرنا حق بجانب ہے کہ انہیں اُنیس صفحوں کے لئے پوری کتاب لکھی گئی ہے۔ اور یہ صحیح بھی ہے کہ شبلی نے انہیں اُنیس صفحوں میں دبیر کے حقیر سے حصے کو سامنے رکھ کر انیس و دبیر کے مقدمۂ شعر کا فیصلہ کیا ہے۔

آگے بڑھنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موازنے کے خلاف بعض نمائندہ تحریروں میں سے وہ جوابات آپ

کے سامنے پیش کردیے جائیں جو انھیں انیس صفحات سے متعلق ہیں۔ شبلی پر لکھنوی زبان سے ناواقفیت کا الزام عائد کرتے ہوئے شیخ محمد جان عروج فیض آبادی اپنی کتاب تردید موازنہ میں لکھتے ہیں:

"موازنہ بھی فنِ شاعری میں اپنا عبور ظاہر کرنے کے لئے لکھا گیا ہے ورنہ انیس و دبیر کا رنگِ سخن جدا جدا ہے اور ان دونوں کا موازنہ ہو ہی نہیں سکتا۔" (۳)

مرزا اوج کے شاگرد منیر شکوہ آبادی پیچیتی بازوں کے سے انداز میں پہلے شبلی کی زبان کو خلاف محاورہ بتاتے ہیں، پھر شبلی کے اعتراضوں کی پانچ قسمیں گنواتے ہیں، پھر اس اعتراض پر جو شبلی نے دبیر کے بعض عربی الفاظ و تراکیب پر یہ کہہ کر کیا تھا کہ اردو زبان کی سلاست و روانی ان لفظوں کی متحمل نہیں ہوسکتی، یہ ردِّعمل ظاہر کرتے ہیں:

"وہ الفاظ مستعملہ عربی و فارسی کون کون سے ہیں جن کا تحمل باوجود استعمال اردو زبان نہیں کرسکتی۔۔۔ تحریر میں الفاظ قلیل الحروف وکثیر المعنی لائے جاتے ہیں کیونکہ اگر ان کے معنی لائے جائیں تو ایک بہت بڑی عبارت ہوجائے۔" (۴)

علیٰ ہذا القیاس افضل حسین ثابت نے "حیاتِ دبیر" کے سولھویں باب کا عنوان "آفتاب میں بڑے بڑے داغ"، رکھ کر شبلی کے یہاں درج ذیل سات قسم کے داغ ڈھونڈے ہیں:

"ناواقفی، نافہمی (48 صفحے)/ زباں دانی کی غلطیاں (12 صفحے)/ اتہام (14 صفحے)/ ہوشیاری (11 صفحے)/ سخت کلامی اور بنانے چندرانے کا داغ (16 صفحے)/ سرقہ اور مولوی شبلی صاحب کا انیس و دبیر کی طرف نسبت دینا (8 صفحے)/ متفرقات چھوٹے چھوٹے بہت سے دھبوں سے مل کر یہ داغ بنا ہے (36 صفحے)۔"

اور المیزان کے مصنف فوق مہابنی کا کہنا ہے کہ "شبلی نے دبیر کے کلام سے مثالیں دے کر جن باتوں کو قابلِ اعتراض قرار دیا ہے وہ باتیں انیس کے یہاں بھی موجود ہیں اور دونوں شاعروں کا متحد المضمون کلام پیش کر کے دبیر کے کلام کو بہتر بتاتے ہوئے فوق بتاتے ہیں کہ شبلی کی پیش کردہ مثالوں سے ان کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔"

آپ نے دیکھا کہ موازنے کے خلاف لکھی جانے والی تحریروں کا تعلق انھیں انیس (19) صفحوں سے ہے جو انیس و دبیر کے براہِ راست موازنے سے متعلق ہیں۔ گویا دبیر پرستوں کی ساری کی ساری صف آرائی انھیں صفحوں کے مندرجات کے خلاف کی گئی اور یوں 266 صفحوں کے وہ مباحث پس پشت جا پڑے جن میں رثائی شاعری کی تعبیر و تفہیم سے متعلق پہلی بار بہت مفید اور کارآمد باتیں کہی گئی تھیں۔

اپنے اصل مبحث پر قائم رہتے ہوئے اب ہم اپنی گفتگو کا زاویہ بدل کر اس سوال کی طرف آنا چاہتے ہیں جو موازنہ اور اس کی جوابی تحریروں کے بار بار پڑھنے کے بعد ہمارے ذہن میں اٹھتا رہتا ہے۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ

شبلی نے کیا واقعی انیس و دبیر کے تقابل کی نیت باندھ کر یہ کتاب لکھی تھی۔ بظاہر اس کا جواب اثبات میں اس لئے ہے کہ شبلی نے آغازِ کتاب میں لکھنؤ کی ہنگامہ خیز فضا کو نگاہ میں رکھ کر انیس کو بڑا شاعر بتاتے ہوئے یہ لکھ دیا تھا کہ "بدمذاقی کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اور مرزا دبیر حریفِ مقابل قرار دیے گئے اور مدت ہائے دراز کی غور وفکر، کدوکاوش، بحث وتکرار کے بعد بھی فیصلہ نہ ہوسکا کہ ترجیح کا مسند نشین کس کو کیا جائے۔"

اس بیان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حالی نے تقابل ہی کی نیت باندھی تھی لیکن اسی کے فوراً بعد کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اس بنا پر مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تنقید و تقریظ لکھی جائے جس سے اندازہ ہوسکے کہ اردو شاعری باوجود کم مائیگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے۔ اس غرض کے لئے میرانیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لئے موزوں نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں، اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے۔ شکر ہے کہ آج اس ارادے کے پورے ہونے کی نوبت آئی اور یہ کتاب ناظرین کی خدمت میں پیشکش ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد شبلی نے اپنے بیان میں یہ جملہ بھی ٹانک دیا:

> "اس کتاب میں میرانیس کا موازنہ 'بھی' مرزا دبیر سے کیا گیا ہے۔"

اس جملے میں 'بھی' کا لفظ بتاتا ہے کہ چلتے چلتے میں نے یہ کام بھی کردیا ہے۔ درج بالا بیان میں آپ نے شبلی کے دل کا چور پکڑا۔ یعنی اب وہ یہ بتاتے ہیں کہ کسی شاعر کو بنیاد بناکر کچھ ایسا لکھا جائے جس سے اندازہ ہو کہ اردو شاعری باوجود کم مائیگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے اور اس کے لئے انہوں نے انیس کا انتخاب اس لئے کیا کہ انیس کی شاعری میں وہ سب کچھ موجود ہے جسے وہ بتانا اور دکھانا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ بات شبلی کے ذہن میں ایسے ہی نہیں آئی۔ انیس کے بارے میں آزاد اور حالی کے بیانات انہوں نے پڑھ رکھے تھے۔ انہیں پڑھنے کے بعد شبلی نے اگر انیس کو نہیں پڑھا ہوگا تو پڑھنا شروع کردیا ہوگا اور اگر پڑھ لیا ہوگا تو دوبارہ اور توجہ سے پڑھا ہوگا اور تب یہ اعتراف کیا ہوگا۔

> "میرانیس کے کمال کا اگرچہ جس قدر مجھ کو اعتراف ہے شاید ہی کسی اور کو ہوگا۔"

اور پھر یہ سوچنا شروع کیا ہوگا کہ جس صنفِ شعر میں انیس اپنی جولانیاں دکھا رہے ہیں اس کو پرکھنے کے پیمانے تو مقرر ہوئے ہی نہیں۔ یہ سوچتے وقت یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ بہ اعتبارِ موضوع انیس کے بیانیے میں بڑی وسعت ہے اور بہ لحاظِ فن اس میں زبردست شاعرانہ رموز پنہاں ہیں اور تب فیصلہ کیا ہوگا کہ اس بیانیے کو بیانِ واقع تک محدود رکھنے کے بجائے اس کے اندر موجود ان معنوی اور لسانی امکانات کی جستجو کی جائے جو بڑی شاعری سے عبارت ہیں اور ظاہر ہے یہ کام کسی اصولی سازی کے بغیر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پھر یہ کہ شبلی کو شاید یہ بھی اچھا نہ معلوم ہوا ہو کہ حالی اردو شاعری کا طویل مقدمہ لکھ رہے ہیں لیکن مرثیے کے ذکر میں نہ تو وہ اس صنف کی ماہیت د

معنویت پر گفتگو کرتے ہیں اور نہ انیس کی توصیف کو مثالوں سے درست ٹھہراتے ہیں۔ واضح رہے کہ مرثیے سے متعلق صفحات میں شروع کے ایک دو صفحوں میں انیس کی توصیف کے بعد حالی نے واقعۂ کربلا کے سبق آموز جزئیات بیان کرنا شروع کر دیے اور انہیں ختم کرنے کے بعد بس اتنا لکھ دیا:

''ہمارے نزدیک نہ صرف اردو بلکہ فارسی و عربی شاعری میں بھی ایسی نظمیں مشکل سے ملیں گی جن میں ایسے اعلیٰ درجے کے اخلاق بیان کیے گئے ہوں۔'' (۲)

یعنی اردو نظم کے وکیل اوّل حالی جہاں نظم کی ایک نمائندہ صنف پر بہت کچھ لکھ سکتے تھے وہاں سرسری طور پر کچھ باتیں کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

درج بالا سطور میں ابھی میں نے موازنے کی ابتدائی عبارت کا حوالہ دیتے وقت انیس کو مرزا دبیر کا حریفِ مقابل قرار دینے والے جملے لکھے تھے۔ لیکن انہیں جملوں سے قبل شبلی یہ بھی لکھ رہے ہیں:

''میر انیس کا کلام شاعری کے تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے لیکن ان کی قدردانی کا طغرائے امتیاز صرف اس قدر ہے کہ کلام فصیح ہوتا ہے اور بین اچھا لکھتے ہیں۔''

یعنی شبلی سمجھ رہے ہیں اور اچھی طرح سمجھ رہے ہیں کہ انیس اور ان سے متعلق صنفِ شعر میں موجود اصل اور اہم اجزا تک پڑھنے اور سننے والوں کی نگاہ پہنچی ہی نہیں ہے۔ اور تب شبلی نے ضروری جانا کہ اس صنف کو پوری طرح سمجھنے کے لئے رثائی شاعری بالخصوص مرثیے کی ایک ایسی شعریات کا وضع کیا جانا ضروری ہے جو اس کے فنی اور بیانیاتی رموز کی راہیں روشن کر سکے اور یہیں شبلی کی باندھی ہوئی نیت ٹوٹ گئی اور یہیں انہوں نے اُن باتوں پر جو آزاد اور حالی انیس اور مرثیے کے بارے میں برائے بیت کہہ کر آگے بڑھ گئے تھے ٹھہر ٹھہر کر نگاہ ڈالی اور انیس کی شاعری کے خصوصیات کے بہانے مرثیے کو سمجھنے کے لئے اپنی شعریات کے درجہ بہ درجہ تنقیحات قائم کئے۔ ان تنقیحات کے پردے میں شبلی بیک وقت دو کام کر رہے تھے۔ ایک طرف وہ انیس کی شاعری کی مدد سے مرثیے کی شعریات بنا رہے تھے اور دوسری طرف اسی شعریات سے انیس کی شاعری کو سمجھا رہے تھے۔ ایک دوسرے کے بدل کے طور پر بننے والی اس شعریات میں انہیں دبیر سے زیادہ سروکار نہیں تھا۔ موازنے کے دو سو چھیاسٹھ صفحوں میں یہ سروکار انہوں نے وہاں وہاں رکھا جہاں جہاں اپنے بحث کی زیادہ وضاحت کے لئے دبیر کو لانا ضروری جانا۔ اب ذرا یہاں ٹھہر کر سوچئے کہ شبلی کی شعریات کے یہ تنقیحات اگر ہمارے سامنے نہ ہوتے تو کیا انیس اس وقت ہماری سمجھ میں آتے اور یہ بھی سوچئے کہ اپنے بیانیے کو فنکارانہ طور پر برتنے کی زبردست قوت اگر انیس میں نہ ہوتی تو کیا شبلی کی شعریات وجود میں آتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شعر انیس اور شعریات شبلی ایک دوسرے کا بدل ہیں۔ یہاں ہم آپ کو یہ بھی بتادیں کہ شبلی کے قائم کئے ہوئے تنقیحات اور ان کی وضاحتیں ہمارے لئے پوری طرح قابل قبول نہیں ہیں کہ بیانیے کی نئی تعبیرات نے انیس کے ہمہ سمت شعری بیانیہ میں نئے جہات وجوانب پیدا کر دیے ہیں۔ اس لئے انیس کو مکرر سمجھنے کے لئے ہمیں ایک نئی اور شبلی سے کہیں بہتر شعریات کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ بحث فی الوقت ہماری گفتگو کے دائرے میں شامل نہیں ہے اور اسے ہم کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ یہاں تو بس ہم یہ بتانا

چاہتے ہیں کہ موازنے کا اصل مقصد موازنے کے بجائے وہ اصول سازی تھی جو انیس کے مثالی مرثیے کو نگاہ میں رکھ کر کی گئی تھی اور جس اصول سازی سے شبلی نے انیس کے مرثیے کو مثالی مرثیہ ثابت کیا تھا۔

تو پھر موازنے کے خلاف یہ شور کیسا؟ اس کا ذمہ دار بھی وہی لفظ ''بھی'' ہے جسے شبلی نے موازنے کی تمہید میں اس جملے میں استعمال کیا تھا: ''اس کتاب میں میر انیس کا موازنہ 'بھی' مرزا دبیر سے کیا گیا ہے۔'' عرض کیا جا چکا ہے کہ دو سو پچاسی صفحوں کی کتاب میں بقول معترضین شبلی نے بہ مشکل اُنیس صفحے انیس و دبیر کے تقابل کے لئے نکالے۔ یہی وہ صفحے ہیں جن میں شبلی نے دبیر کا کمزور اور وہ کلام جو ان کا نہیں تھا، سامنے رکھا اور اسی لئے یہ بات کہی گئی کہ شبلی نے کلامِ دبیر کا تفصیلی اور ہمدردانہ مطالعہ نہیں کیا اور یوں موازنے کی شرط کا لحاظ نہیں رکھا۔ دبیریوں کی طرف سے شبلی پر کلام انیس کے مقابل یہ جو کمزور کلام کے رکھنے کا الزام ہے یہاں اس کے رد کے لئے اسی زمانے میں لکھی ہوئی افضل حسین ثابت کی کتاب ''حیاتِ دبیر'' پر ایک تیکھے تبصرے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''افضل حسین ثابت دبیر کو بہترین شاعر، قدرتی شاعر اور اردو کا خدائے سخن کہتے ہیں لیکن ان کی کتاب سے اس دعوے کی تائید نہیں ہوتی۔ انہوں نے کتاب میں دبیر کا منتخب یعنی بہترین کلام پیش کیا ہے۔ لیکن مجھے اس کتاب کے اثنائے مطالعہ میں اکثر جگہ ایسا کلام ملا ہے جو میرے نزدیک قابلِ اعتراض ہے۔ جب بہترین کلام کی یہ حالت ہے تو بقیہ کلام کیسا ہوگا۔'' (۷)

حسین رضوی کی نگاہ میں دبیر کے منتخب اور بہترین کلام میں بھی سقم اور نقص موجود ہے۔ تو شبلی بھی اگر دبیر کا وہی کلام جو ثابت نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے بعد چنا ہے، اپنے سامنے رکھتے تب بھی نتیجہ وہی نکلتا جو دبیریوں کی آزردگی کا سبب ہے۔ ستم بالائے ستم کہ شبلی نے دبیر سوزی کے اس عمل میں جا بجا توہین آمیز اور اشتعال انگیز لہجہ اختیار کیا جس نے دبیر پرستوں کی آزردگی کو طیش میں بدل دیا۔ ایسے جملوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے شبلی نہیں کلیم الدین احمد یا شمس الرحمٰن فاروقی بول رہے ہوں۔ یہ فقرے ملاحظہ ہوں:

1- کس قدر بھدے الفاظ و بھدی ترکیبیں ہیں۔ (۸)
2- ہاتھ میں پہننے کی انگوٹھی پر سورج کا نگینہ جڑنا کس قدر لغو بات ہے۔ (۹)
3- اظہار کے لئے مرزا صاحب نے جو طریقہ استعمال کیا ہے وہ کس قدر سفیہانہ اور عامیانہ ہے..... نہایت پست اور مبتذل خیال ہے۔
4- کس قدر بیہودہ تشبیہ ہے۔

موازنے میں یہ اور اسی طرح کے دوسرے جملے بار بار استعمال ہوئے ہیں اور اسی لئے دبیریوں کی جانب سے شبلی پر یہ سنگین الزام بھی لگایا گیا کہ موازنہ انیس و دبیر دونوں کے خلاف ہے اور یہ کتاب شبلی نے خود کو ایک بڑا عالم ثابت کرنے کے لئے لکھی ہے۔

اپنی گفتگو کے اس محل پر میں دبیریوں اور شبلی دونوں کا وکیل بن کر موازنے کے اس مقدمے کو درج ذیل سوالوں اور جوابوں کی صورت میں آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ پہلے دبیریوں کی جانب سے یہ استفسارات

ملاحظہ ہوں:

1- جب شبلی نے انیس کو بڑا شاعر پہلے ہی مان لیا تھا اور رثائی شاعری کی ساری خوبیاں ان میں دیکھ لی تھیں تو "میرانیس اور مرزادبیر کا موازنہ" باب قائم کرنا کیا ضرور تھا؟

2- انیس کو برتر ثابت کرنے کے لئے انہوں نے دبیر کے اتنے کم کلام ہی کو کیوں بنیاد بنایا۔

3- جس تفصیل اور دلجمعی کے ساتھ شبلی نے انیس کا مطالعہ کیا تھا اسی تفصیل اور دلجمعی کے ساتھ انہوں نے دبیر کا مطالعہ کیوں نہیں کیا۔

4- جن مباحث کو مستحکم کرنے کے لئے انیس کی مثالیں دی گئی ہیں وہاں دبیر کے کلام سے بھی مدد لی جاسکتی تھی۔ یا شبلی کو ان مباحث کے لئے دبیر کے یہاں موزوں مثالیں ملیں ہی نہیں۔

5- وہ کلام جو دبیر کا نہیں ہے، تصدیق کے بغیر شبلی نے اسے دبیر سے کیوں منسوب کیا؟

اور اب شبلی کی پیروی میں درج بالا اعتراضات کے یہ جوابات دیکھئے۔

1- موازنے کا باب قائم کرنا اس لئے ضروری تھا کہ دبیر پرست دبیر کو انیس کے مقابلے پر یہ جانے بغیر لے آئے تھے کہ انیس کی شاعری کی فنی خوبیاں اور اس کے معنوی امکانات کیا ہیں؟

2- جو نتائج شبلی نے کم مثالیں دے کر اخذ کئے ہیں، وہی مثالوں کی فراوانی کے بعد بھی برآمد ہوتے۔

3- ہمارے پاس ایسی کوئی داخلی شہادت نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ شبلی نے دبیر کا تفصیل سے مطالعہ نہیں کیا تھا۔ دبیر کو اچھی طرح پڑھنے کے بعد بقدر ضرورت بحث انہوں نے اپنا کام نکال لیا۔

4- موازنے کے مباحث کی وضاحت اور ان کے اثبات کے لئے انہیں انیس ہی کے یہاں موزوں مثالیں ملتی چلی گئیں اس لئے انہوں نے دبیر کی مثالوں کو لانا ضروری نہیں سمجھا۔

5- آب حیات میں واقعاتی لغزشوں کے راہ پانے سے قبل آزاد نے بہت سے دبیریوں سے رجوع کیا لیکن کسی نے انہیں جواب نہیں دیا۔ ممکن ہے کہ شبلی نے بھی "مغیر دبیری" کلام کے بارے میں اپنے شکوک رفع کرنے کے لئے مستند جوابوں کی جستجو کی ہو لیکن یہ حوالے انہیں فراہم نہ کئے گئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے یہ ان کے ذہن قلم کی سہو کا نتیجہ ہو۔

تو موازنے کے قضیے پر اب تک کی گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ شبلی موازنہ نہیں بلکہ اس کی آڑ میں انیسی مرثیے کو سامنے رکھ کر رثائی شاعری کی شعریات لکھ رہے تھے اور چلتے چلاتے موازنے کی ضرورت انہیں اس لئے محسوس ہوئی کہ اپنی شعریات کے خطوط روشن کرتے وقت انہوں نے انیس کے یہاں جن معانی ومحاسن کو نمایاں کیا ہے وہ کہیں اور نظر نہیں آتے اور اس کہیں اور کے لئے انہیں انیس کے فوری معاصر دبیر کی طرف جانا پڑا۔ سو برس قبل جب تنقید اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی شبلی کی نگاہ نقد کی تیزی کا اندازہ آج کے ایک بڑے نقاد کو سامنے لاکر لگایا جاسکتا ہے: "بندش کی سستی اور ناہمواری" کے ذیل میں شبلی نے انیس کے جواب میں لکھے جانے والے دبیر کے مرثیے کے اس بند کو نقل کیا ہے:

اے دبدبۂ نظم دوعالم کو ہلادے
اے طنطنۂ طبع جز وکل کو ملادے

اے معجزۂ فکر فصاحت کو جلا دے
اے زمزمۂ نطق بلاغت کا صلہ دے
اے بائے بیاں معنیِ تسخیر کو حل کر
اے سین سخن قاف سے تا قاف عمل کر

اور لکھا ہے کس زور وشور کی اٹھان ہے، کیسے پُر رعب الفاظ ہیں لیکن معانی میں بہت کم ربط ہے۔ طنطنے کو جز وکل سے ملا دینے سے کیا نسبت ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مضمون ''دبیر کے مرثیوں میں بیانیہ'' کا آغاز اسی بند سے کیا ہے اور لفظوں کے ردّ و بدل سے سستی اور ناہمواری کا وہی نتیجہ نکالا ہے جو شبلی بہت پہلے نکال چکے ہیں۔

O

شبلی کے زمانے میں (بلکہ آج بھی) اُن دبیریوں کو جنہوں نے دبیر کو نہ پوری طرح پڑھا تھا نہ سمجھا تھا، یہ سمجھانا مشکل تھا کہ دبیر اپنی آزادانہ حیثیت میں بڑے بلکہ بہت بڑے شاعر ہیں لیکن جب ہم انہیں انیس کے مقابلے پر لاتے ہیں تو وہ اتنے بڑے نہیں معلوم ہوتے اور یہ اس لئے کہ رثائی بیانیے کے سارے اجزاء ولوازم دبیر کے یہاں اُس طرح نظر نہیں آتے جیسے انیس کے یہاں موجود ہیں۔ اپنی شعریات کی تہ میں شبلی نے دبیر کے چاہنے والوں کو یہی سمجھایا ہے۔ اسی لئے اب ہماری دیانتداری کا تقاضا ہے کہ مرثیے کی اوّلین شعریات کے لئے ہم شبلی کے شکر گزار ہو کر انہیں اُس کٹہرے سے باہر نکالیں جس میں دبیر کشی کے جرم میں وہ سو سے زیادہ برسوں سے خاموش کھڑے ہیں۔

حواشی:

۱۔ وضع داران لکھنؤ: سید محمد ہادی لکھنؤ، صفحہ-۵۱
۲۔ آبِ حیات، صفحہ-۵۱۷
۳۔ صفحہ: ۳۴۸
۴۔ رثائی ادب، دبیر نمبر، صفحہ: ۳۵۰
۵۔ صفحہ: ۳۹۰
۶۔ مقدمہ، صفحہ: ۱۸۸
۷۔ حیات دبیر پر ایک نظر: سید حسین رضوی میرٹھی، لکھنؤ ۱۹۱۴ء، صفحہ: ۱۰-۱۱
۸۔ صفحہ: ۲۴۳
۹۔ صفحہ: ۲۴۴

شبلی نعمانی: کتابیات

سہیل عباس بلوچ

ABSTRACT:

Amongst the Urdu writers of 20th century Shiblee Naumani is the most prolific figure. He late 19th and early showed his genius in various aspects of Urdu literature. His style is full of grandeur with finest blend of sophistication and power of knowledge.

Shibli was really a man of letters. He wrote biographies, poetry, criticism and travelogue, Shibli's work in the field of "SeeratNigri" is the masterpiece of Urdu literature. The author of this article has presented a detailed bibliography of shibli's works and mentioned a great number of critical books o Shiblee's, essays and articles about this personality.

مولانا شبلی (۱۸۵۷ء۔ ۱۸ رنومبر ۱۹۱۴ء/ ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ) قصبہ بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ مولوی محمد فاروق چریا کوٹی سے تعلیم حاصل کی۔ عربی، فارسی، فقہ، حدیث، فلسفہ، منطق اور ہندسہ کے علوم سیکھے۔ ان کے والد شیخ عبداللہ وکیل تھے۔ شبلی نے بھی کچھ دن وکالت کی۔ (۱۸۸۳ء) علی گڑھ آئے۔ وہاں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ وہیں انھیں سرسید، حالی، محسن الملک اور پروفیسر آرنلڈ کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ (۲۰ رجون ۱۸۸۳ء) نیشنل سکول کے نام سے ایک انگریزی مدرسہ جاری کیا۔ جو بعد میں ترقی کر کے ۱۸۸۷ء میں مڈل اسکول اور ۱۸۹۵ء میں ہائی سکول ہو گیا۔ (۱۸۸۶ء) آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے اجلاس میں انھوں نے جدید تعلیم کے سلسلے میں ایک ریزولیشن پیش کیا جس کی تائید سرسید نے کی۔ (۲۹ راپریل ۱۹۰۰ء) لکھنؤ میں ایک اردو ڈیفنس سینٹرل کمیٹی بنائی گئی۔ جس کے زیر اہتمام ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں گورنمنٹ کی ہندو نواز جانب دار پالیسی کی مذمت کی گئی لیکن گورنر میکڈانلڈ اردو کا زبردست مخالف تھا اس وجہ سے یہ کمیٹی ختم ہو گئی۔ ۴ رجنوری ۱۹۰۳ء میں کانفرنس کے اجلاس میں اس کے مختلف شعبے قائم کیے گئے، ایک ''شعبہ انجمن ترقی اردو'' کا تھا۔ اس کے صدر مسٹر آرنلڈ، نائب صدر مولوی نذیر احمد، ذکاء اللہ اور مولانا حالی تھے۔ مولانا شبلی کو سیکرٹری بنایا گیا۔ (۱۹۰۱ء) سررشتہ علوم

دفنون کی جگہ پر حیدرآباد میں تقرر ہوا۔(۱۹۱۴ء) دارالمصنفین کاسنگِ بنیاد رکھا۔
تصانیف:

المامون۔(سوانح) ۱۸۸۷ء

سیرۃ النعمان۔(حضرت امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ کی سوانح عمری)۔جنوری ۱۸۹۲ء۔۱۸۹۸ء میں مکمل ہوئی۔

سفر نامہ۔۱۸۹۲ء۔مسٹر آرنلڈ کے ہمراہ روم،مصر،شام اور قسطنطنیہ کا سفر کیا۔

الفاروق۔(حضرت عمر فاروق اعظمؓ کی سوانح عمری)۔۱۸۹۹ء۔

شعر العجم۔پہلی جلد ۱۹۰۱ء میں شروع ہوئی اور پانچویں جلد ان کی وفات کے چار سال بعد ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔اس میں نظری و عملی تنقید،اور اصول شعر کی روشنی میں فارسی شاعری کی تاریخ و تمدن کو واضح کیا ہے۔

الغزالی۔۱۹۰۲ء۔

سوانح مولانا روم۔۱۹۰۴ء۔

الکلام۔۱۹۰۴ء۔جدید علم الکلام یعنی نئے فکری مسائل کو قدیم اصولوں کی روشنی میں جانچا ہے۔

موازنہ انیس و دبیر۔اس میں مرثیہ نگاری کے فن پر بحث اور انیس و دبیر کے مرثیوں کا تقابلی تجزیہ ہے۔

سیرت النبی۔مکمل نہ کر سکے،بعد میں ان کے شاگرد سلیمان ندوی نے اسے مکمل کیا۔

مضامین:

''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم''۔۱۸۸۴ء

''کتب خانہ اسکندریہ''۔۱۸۸۹ء

''الجزیہ''۔۱۸۸۹ء

لیکچر:

''اسلام کی بے تعصبی''۔۱۹۰۴ء۔کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں۔

''تاریخ اسلام''۔۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء۔کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں۔

ویب سائٹ:

http://www.shibliacademy.org/book/export/html/10

تصنیفاتِ شبلی نعمانی

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ نے بیانِ خسرو کے سرورق کے بعد مولانا شبلی نعمانی کی کتب کا اشتہار دیا ہے،اس پر ملنے کا پتا الناظر بک ایجنسی لکھنؤ لکھا ہوا۔اس فہرست میں درج ذیل کتابوں کا اشتہار ہے۔☆سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ☆مجموعۂ کلام شبلی ☆مثنوی صبح امید ☆شعرالعجم ☆الفاروق ☆الغزالی ☆سیرۃ النعمان ☆المامون

☆سوانح عمری مولانا روم ☆بیان خسرو☆علم الکلام ☆رسائل شبلی ☆مقالات شبلی ☆آغاز اسلام☆مضامین عالمگیر ☆کتب خانہ اسکندریہ☆زیب النسا بیگم☆جہانگیر☆اسلامی حکومت☆موازنہ انیس و دبیر ☆الانتقاد☆دیوان شبلی ☆دستہ گل ☆بوے گل ☆برگِ گل۔

الغزالی: (کانپور: مطبع نامی، ۱۹۰۲ء)(اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۹۲۸ء، ۲۱۷ص)

الفاروق: (اعظم گڑھ، مطبع معارف، ۱۹۵۶ء، ۴ + ۱۰۲ + ۲۹۱ص)(کراچی: تاج کمپنی، ۱۹۶۳ء) الفاروق، حصہ اول۔ (مراد آباد: برلاس پریس، ۱۹۰۵ء، ۶۹۶ص) الفاروق، حصہ اول۔ (دہلی: قومی پریس، ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء، ۲۷۱ص)۔ الفاروق۔ حصہ دوم: (کانپور: نامی پریس، ۱۸۹۹ء، ۳۱۲ص) الفاروق، حصہ دوم۔ (مراد آباد: برلاس پریس، ۱۹۰۷ء، ۲۷۲ص)۔ الفاروق -حصہ اول و دوم مکمل، س ن (لاہور: ناشر، شیخ غلام علی اینڈ سنز) (حصہ اول ۱۹۴ مضامین صفحہ ۳۷ تا ۲۳۶ حصہ دوم ۳۴۱ مضامین صفحہ ۲۳۹ تا ۵۴۴)

الکلام: (کانپور: نامی پریس، ۱۹۰۴ء، ۳۰۸ص)(سلسلہ آصفیہ جلد ہشتم، حصہ دوم۔لکھنؤ: عمدۃ المطابع، ۱۹۰۶، ۲۷۸ص)(سلسلہ آصفیہ جلدنہم، حصہ دوم۔کانپور: نامی پریس، ۱۹۰۴ء، ۳۱۰ص)(اعظم گڑھ: مطبع معارف، طبع چہارم، ۱۳۴۱ء، ۲۷۵ص)(اعظم گڑھ : مطبع معارف، طبع پنجم، ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء)(لکھنؤ: شبلی بک ڈپو، ۱۳۴۰ھ، ۲۵۴ص)

المامون۔ شبلی نعمانی، (اعظم گڑھ : دار المصنفین، مطبع معارف، ۱۹۲۶ء، ۲۴۴ص)(لاہور: اردو پریس، ۱۹۶۰ء)

اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر: (لاہور: اُردو مرکز، طبع ششم، ۱۹۴۹ء، ۱۲۸ص) چنیوٹ: مشمولہ مجلّہ ''البصیر''، عالمگیر نمبر، ۸۶ص۔ دیباچہ و تصحیح۔ شیخ عطاءاللہ (لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۷۶ء، ۲۱۵ص)۔ مقدمہ۔ مولانا غلام رسول مہر

آغاز اسلام: مولانا شبلی نے یہ کتاب عربی میں لکھی تھی، اس کا فارسی ترجمہ مولانا حمید الدین نے کیا، اردو ترجمہ ''بدر الاسلام'' علیا جناب میمونہ سلطان، شاہ بانو صاحبہ (بیگم صاحبہ نواب زادہ میجر محمد حمید اللہ خاں)، بھوپال: مطبع سلطانی ریاست بھوپال، ۱۹۱۵ء۔ ۷۷ص

باقیات شبلی: مرتبہ مشتاق حسین، لاہور: مطبع عالیہ زریں آرٹ پریس، مئی ۱۹۶۵ء

برگ گل: شبلی نعمانی کے قصائد اور فارسی غزلوں کا مجموعہ، لکھنؤ: انوار المطابع، ۳۰ص

بیان خسرو: امیر خسرو کی سوانح عمری اور ان کے کلام پر محققانہ ریویو، لکھنؤ: الناظر پریس، س۔ن، ۸۸ص

حیات حافظ: ۔شعر العجم کے اقتباسات کو الگ الگ شائع کیا گیا ہے۔ دہلی: رنگیں پریس، ۱۹۲۳ء، ۵۷ص

حیات خسرو: ۔شعر العجم کے اقتباسات کو الگ الگ شائع کیا گیا ہے۔ (لکھنؤ: دائرہ ادبیہ، ۱۹۲۲ء، ۱۰۶ ص) (دہلی: جامعہ ملیہ برقی پریس، س۔ن، ۵۶ص)

حیات سعدی: ۔شعر العجم کے اقتباسات کو الگ الگ شائع کیا گیا ہے۔ (دہلی: رنگین پریس، س، ن، ۵۲،

ص)(دہلی: خواجہ برقی پریس، س،ن ۴۸ص)(بجنور: مدینہ بک ایجنسی، س۔ن، ۴۷ص)

خطبات شبلی ۔شبلی نعمانی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۱۹۴۱ء

دیوان شبلی ۔شبلی نعمانی، کانپور: مطبع نامی، باہتمام محمد رحمت اللہ رعدؔ، س۔ن، ۲۷ص

رسائل شبلی: دہلی: رحمانی پریس، ۱۸۹۸ء، ۲۸۷ص ۔مشمولات:۔ دیباچہ از شبلی نعمانی، اسلامی حکومتیں اور شفا خانے، اسلامی کتب خانے، حقوق الذمیین، الجزیہ، میکینکس اور مسلمان، خطبہ، ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس ۱۲راپریل ۱۸۹۵ء کو پڑھا، انظرفی السفر الی المؤتمر، کتب خانہ سکندریہ، تراجم، اسلامی مدارس، قدیم تعلیم

سوانح عمری فردوسی: شعر العجم کے اقتباسات کو الگ الگ شائع کیا گیا ہے۔ دہلی: مطبع مجتبائی، س۔ن، ۶۳ص

سفر نامۂ ارض روم، مصر اور شام: (آگرہ: مطبع مفید عام ۱۸۹۴ء، ۲۳۵ص)(دہلی: رحمانی پریس، طبع سوم، ۱۳۳۵ھ، ۴+۱۶۰ص)(اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۹۴۰ء، ۲۴۲ص)

سوانح مولانا روم: (کانپور: مطبع نامی، ۱۹۰۶ء)(امرتسر: روز بازار الیکٹرک پریس، ۱۹۰۸ء، ۲۰۰ص)(بجنور، مدینہ پریس، س۔ن، ۱۲۸ص)(دہلی: مہتاب پریس، س۔ن، ۱۰۸ص)(اعظم گڑھ: معارف پریس، ۱۹۳۸ء، ۱۷۸ص)(لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء، ۲۶۰ص)۔ بہ ترتیب و تقدیم سید عابد علی عابدؔ

سیرت النعمان: (علی گڑھ: ۱۸۹۱ء)(آگرہ: مطبع مفید عام ۱۸۹۲ء، ۳۱۰ص)(دہلی: مطبع مجتبائی، ۱۸۹۳ء، ۳۱۰ص)

شعر العجم جلد اول: (اعظم گڑھ: مطبع معارف، طبع چہارم، ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء، ۴+۳۶۲ص)۔ اولین طباعت: ۱۹۰۸ء، (لاہور: شیخ مبارک علی اینڈ سنز، ۱۹۳۹ء)

شعر العجم جلد دوم: (اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۹۴۷ء، ۳۰۲ص)۔ اولین طباعت: ۱۹۰۹ء

شعر العجم سوم: (اعظم گڑھ: مطبع معارف، طبع چہارم، ۱۹۴۵ء، ۲+۲۰۶ص)۔ اولین طباعت: ۱۹۱۰ء

شعر العجم چہارم: (اعظم گڑھ: مطبع معارف: ۱۹۵۱ء، ۲+۳۳۹ص)۔ اولین طباعت: ۱۹۱۲ء

ظل الغمام فی مسئلہ القرأۃ خلف الامام: کانپور، مطبع نامی ۱۲۹۲ھ، ۴۰ص

علم الکلام: (آگرہ: مطبع مفید عام ۱۹۰۳ء، ۲۳۵ص)(علم الکلام ۔شبلی نعمانی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۱۹۴۵ء)

فردوسی: دہلی: قومی پریس، س۔ن، ۶۳ص

فیضی: دہلی: قومی پریس، س ن، ۳۲ص

کلیات شبلی: شبلی نعمانی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، س۔ن

کلیات شبلی اُردو: سید سلیمان ندوی، مرتبہ، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۹ء، ۱۰۷ص

مکاتیب شبلی ۔شبلی نعمانی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۱۹۲۸ء

موازنہ انیس و دبیر۔ شبلی نعمانی، (آگرہ :مفید عام ،۱۹۰۷ء،۲۷۶ص)(الہ آباد:مطبع انوار احمدی، ۱۹۲۵ء،۳۶۰ص)(لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۶۴ء) (فضل امام،مرتب علی گڑھ : ایجوکیشنل بک ڈپو،۱۹۸۱ء،۳۰۴ ص)

مقالات شبلی

مقالات شبلی ۔جلد اول ،مذہبی(اعظم گڑھ:مطبع معارف ،۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء، ۱۷۸ص)(مرتبہ مولوی مسعودعلی، جلد اول،اعظم گڑھ:معارف،۱۹۵۴ء)

مقالات شبلی ۔مرتبہ مولوی مسعودعلی،جلددوم،اعظم گڑھ:معارف،۱۹۵۵ء

مقالات شبلی ۔مرتبہ مولوی مسعودعلی،جلدسوم،اعظم گڑھ:معارف،۱۹۳۲ء

مقالات شبلی ۔مرتبہ مولوی مسعودعلی،جلد چہارم،اعظم گڑھ:معارف،۱۹۳۴ء

مقالات شبلی ۔مرتبہ مولوی مسعودعلی،جلد پنجم،اعظم گڑھ:معارف،۱۹۳۴ء

مقالات شبلی ۔مرتبہ مولوی مسعودعلی،جلدششم،اعظم گڑھ:معارف،۱۹۵۱ء

مقالات شبلی ۔مرتبہ مولوی مسعودعلی،جلدہفتم،اعظم گڑھ:معارف،۱۹۳۸ء

مقالات شبلی ۔مرتبہ مولوی مسعودعلی،جلدہشتم،اعظم گڑھ:معارف،۱۹۳۸ء

رسالہ الندوہ میں مقالات شبلی

فلسفہ یونان اور اسلام ۔شمس العلما مولوی شبلی نعمانی،جلد ا،نمبر۴،ماہ شعبان۱۳۲۲ھ،ص ۲۰

الاسلام ۔شمس العلما مولوی شبلی نعمانی،جلد ا،نمبر۵،ماہ رمضان۱۳۲۲ھ،ص ا

فن بلاغت ۔شمس العلما مولوی شبلی نعمانی،جلد ا،نمبر۵،ماہ رمضان۱۳۲۲ھ،ص ۲۱

فن نحو کی مروجہ کتابیں ۔شمس العلما مولوی شبلی نعمانی،جلد ا،نمبر۶،ماہ شوال ۱۳۲۲ھ،ص ا

جبر و قدر ۔شمس العلما مولوی شبلی نعمانی،جلد ا،نمبر۶،ماہ شوال ۱۳۲۲ھ،ص ۵

ابن رشد ۔شمس العلما مولوی شبلی نعمانی،جلد ا،نمبر۷،ماہ ذیقعدہ ۱۳۲۲ھ،ص ا

مویدان مجوس ۔شمس العلما مولوی شبلی نعمانی،جلد۲،نمبر۶،ماہ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ستمبر ۱۹۰۵ء،ص ۳

نظم القرآن و جمہرۃ البلاغہ ۔شمس العلما مولوی شبلی نعمانی،جلد۲،نمبر۱۰،ماہ شوال ۱۳۲۳ھ مطابق دسمبر ۱۹۰۵ء،ص ا

ریاست حیدر آباد کی مشرقی یونی ورسٹی ۔علامہ شبلی نعمانی،جلد ۶،نمبر۳،ماہ صفر ۱۳۲۷ھ مطابق مارچ ۱۹۰۹ء،ص ۶

شعر و ادب ۔مولانا شبلی نعمانی،جلد ۶،نمبر۱۱،ماہ ذیقعدہ ۱۳۲۷ھ مطابق دسمبر ۱۹۰۹ء،ص ا

ابو طالب کلیم ۔مولانا شبلی نعمانی،جلد ۶،نمبر۱۱،ماہ ذیقعدہ ۱۳۲۷ھ مطابق دسمبر ۱۹۰۹ء،ص ۹

سیرت نبوی۔مولانا شبلی نعمانی، جلد ۹،نمبرا، ماہ محرم ۱۳۳۰ھ مطابق جنوری ۱۹۱۴ء، ص۵
اختلاف اور مُسامحت۔مولانا شبلی نعمانی، جلد ۹،نمبرا، ماہ محرم ۱۳۳۰ھ مطابق جنوری ۱۹۱۴ء، ص۹
ندوہ کے مقاصد پر پہلی تقریر۔علامہ شبلی مرحوم، الندوہ ،جلد ا ،نمبرا، ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ مطابق جنوری ۱۹۴۰ء، ص ۱۱
ندوہ کے مقاصد پر پہلی تقریر۔علامہ شبلی مرحوم، الندوہ ، جلد ا ،نمبر۲، محرم الحرام ۱۳۵۹ھ مطابق فروری ۱۹۴۰ء، ص ۱۶

شبلی پر کتابیں:

المیزان: جواب موازنہ انیس و دبیر۔نظیرالحسن فوق رضوی، علی گڑھ: مطبع فیض عام، ۱۹۰۸ء، ۶۱۰ص
تذکرہ شمس العلما مولینا شبلی مرحوم ۔محمد مہدی، مُرتبہ، آگرہ: شمسی مشین پریس ۱۹۲۵ء، ۶۱ص
تنقید شعر العجم ۔محمود شیرانی، حافظ، دہلی، انجمن ترقی اُردو ۱۹۴۲ء
حسن البیان فیافی سیرت النعمان۔محمد عبدالعزیز رحیم آبادی، (دہلی: مطبع فاروقی ، ۱۳۱۱ھ، ۲۳۶ص) (دہلی: جید برقی پریس ، س۔ن، ۱۶۰ص) (لاہور، اہل حدیث اکادمی ، ۱۳۸۵ھ، ۱۷۵ص)۔طبع لاہور میں مولانا محمد عطاءاللہ حنیف کے قلم سے مقدمہ اور مؤلف کے حالات زندگی شامل کئے گئے ہیں۔
حیات شبلی۔سلیمان ندوی، سید، (اعظم گڑھ: مطبع معارف طبع اول ۱۹۴۳ء، ۸۴۶ص) (اعظم گڑھ: مطبع معارف طبع دوم، ۱۹۷۰ء، ۸۴۸ص)
حیات شبلی۔عبدالسلام ندوی، غیر مطبوعہ، اعظم گڑھ: کتاب خانہ دارالمصنفین
حیاتِ شبلی پر سیر حاصل و بے لاگ تبصرہ۔مولانا سید سلیمان ندوی
خطوطِ شبلی بنام محترمہ زہرا بیگم فیضی و عطیہ فیضی۔محمد امین زبیری، سید محمد یوسف قیصر، مُرتبین، بھوپال: ظِل السلطان بک ایجنسی، س۔ن
خلاصہ حیاتِ شبلی۔عبدالرزاق قریشی، بمبئی: اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، س۔ن
ذکر شبلی۔محمد امین زبیری، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۳ء، ۱۴۸ص
ذکر شبلی۔محمد امین زبیری، لاہور: مکتبہ جدید نومبر ۱۹۵۲ء، ۱۴۸ص
ذکر شبلی۔مولوی محمد امین زبیری مارہروی، لکھنؤ: ادبی پریس ۱۹۴۶ء، ۲۴۵ص
ردالموازنہ۔افضل علی میر متخلص بہ قصو، لکھنؤ: ۲۶-۱۳۲۵ھ
سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ۔عبداللہ، ڈاکٹر سید، لاہور: مکتبہ کاروان، باردوم، ۱۹۶۵ء، ۳۲۰ص
شاہکار شبلی۔محمود آزاد، سید، لاہور: مکتبہ شاہکار، ۱۹۷۸ء، ۹۰ص

شبلی۔ محمد مہدی، آگرہ: بشیر پاشا سیریز، ۱۹۲۵ء، ۶۱ص
شبلی۔ عبدالسلام خورشید، لاہور: قومی کتب خانہ، ۱۹۵۲ء، ۹۶ص
شبلی۔ نصیرالدین، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، س۔ن، ۶۴ص
شبلی ادیبوں کی نظر میں۔ محمد واصل عثمانی، کراچی: صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸ء، ۲۸۶ص
شبلی ایک دبستان۔ آفتاب احمد صدیقی، ڈاکٹر، (کراچی: ایجوکیشنل پریس، ۱۹۵۷ء)، (ڈھاکہ: مکتبہ عارفین، ۱۹۷۰ء، ۲۶۸ص)
شبلی بحیثیت مؤرخ۔ اختر وقار عظیم، لاہور: تصنیفات، ۱۹۶۸ء، ۲۶۴ص
شبلی بلادِ اسلامیہ میں۔ محمد واصل عثمانی، س۔ن، ۶۴ص
شبلی کا تنقیدی شعور۔ محمد اسحاق ہاشمی، کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۰ء، ۲۷۲ص
شبلی کا مرتبہ: اُردو ادب میں۔ عبداللطیف اعظمی، (دہلی: شبلی اکادمی، ۱۹۴۵ء، ۲۰۷ص) (کراچی: صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۷ء، ۲۰۹ص)
شبلی کی حیات معاشقہ۔ وحید قریشی، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۰ء، ۱۰۲ص
شبلی کی رنگین زندگی۔ محمد امین زبیری، لاہور: فاروق عمر پبلشرز، ۱۹۵۲ء، ۹۶ص
شبلی کی زندگی کا ایک رنگین ورق۔ محمد امین زبیری، بھوپال: سنٹرل انڈیا پریس، ۱۹۳۶ء، ۴۱ص
شبلی کی علمی و ادبی خدمات۔ ڈاکٹر خلیق انجم، نئی دہلی: انجمن ترقی اُردو، ہند، ۲۰۱۰ء
شبلی نامہ۔ محمد اکرام، شیخ، بمبئی: کتب خانہ تاج آفس، س۔ن، ۷۵ص
شبلی نعمانی۔ انوار الحسن، لکھنؤ: ادارہ فروغ اُردو، ۱۹۵۷ء، ۳۲ص
شبلی نقادوں کی نظر میں۔ محمد واصل عثمانی، کراچی: صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۷ء، ۱۳۲ص
علامہ آخرالزمان۔ محمد عمادالدین انصاری شیرکوٹی۔ ''علم الکلام'' پر تنقید و تبصرہ
کتاب نامۂ شبلی۔ اختر راہی، لاہور: مسلم اکیڈمی، محمد نگر، علامہ اقبال روڈ، فروری ۱۹۷۱ء، ص ۶۴
کسوف الشمسین۔ احسن مارہروی، بدیون: نظامی پریس، ۱۹۱۵ء، ۱۹۱۴ء میں کے بعد دیگرے مولانا شبلی اور مولانا حالی فوت ہوئے۔ دونوں حضرات کا مرثیہ ''غم شبلی اور ماتم حالی'' کے نام سے لکھا گیا جو مقدمہ کے ساتھ طبع ہوا۔ (بحوالہ کتاب نامہ شبلی۔ ص ۲۵)
مطالعہ شبلی۔ ناظر کاکوروی رشجاعت علی سندیلوی، لکھنؤ: ادارہ فروغ اُردو، ۱۹۵۶ء
مطائبات شبلی۔ جاب مظہری، (لکھنؤ: ادارہ فروغ اُردو) (بمبئی: علوی بک ڈپو، س۔ن ۱۲۸ص)
مقالات یوم شبلی۔ نذر احمد، حافظ، لاہور: مسلم اکادمی، ۱۹۶۸ء، ۹۵ص
مقالات یوم شبلی۔ عبید اللہ خان، لاہور: اُردو مرکز، سویرا آرٹ پریس، ۱۹۶۱ء، ۳۰۰ص۔ مئی ۱۹۵۷ء میں اسلامیہ کالج چنیوٹ میں یوم شبلی منایا گیا۔ اس موقع پر ''البصیر'' کا شبلی نمبر شائع ہوا۔ جو چند مضامین کی کمی بیشی کے

بعد ''مقالات شبلی'' کے نام سے شائع کیا گیا۔

مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں۔عبداللطیف اعظمی ،دہلی : شبلی اکادمی ،قرول باغ طبع اول، (۱۹۴۵ء)،۲۰۱ص

مولانا شبلی کا مرتبہ أردو أدب میں،عبداللطیف اعظمی ،(دہلی: شبلی اکادمی مئی ۱۹۴۵ء،۲۱۰ص)(کراچی: صفیہ اکیڈمی ۱۹۶۷ء،۲۱۰ص)

مولانا شبلی :أردو کے بہترین انشا پرداز۔سعید انصاری ،(اعظم گڑھ: ۱۹۳۴ء،۶۴ص)(لکھنؤ:الناظر پریس،باردوم،۱۹۳۴ء،۶۴ص)

یادگار شبلی۔محمد اکرام، شیخ، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ،۱۹۷۱ء،۴۵۶ص

شبلی پر جامعاتی تحقیق:

پی ایچ-ڈی

أردو تنقید نگاری کے ارتقاء میں شبلی نعمانی کا حصہ۔ڈاکٹر عائشہ خاتون،نگران ڈاکٹر وہاج الدین علوی، جامعہ ملیہ اسلامیہ،دہلی ۲۰۰۴ء

دبستان شبلی کے علمی و ادبی کارنامے۔محمد نعیم ندوی، غیر مطبوعہ، مقالہ برائے پی،ایچ،ڈی، جامعہ سندھ حیدرآباد،۱۹۷۱ء

شبلی اور ان کی تصانیف۔آفتاب احمد صدیقی، غیر مطبوعہ، مقالہ برائے پی،ایچ،ڈی، شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

شبلی بحیثیت سوانح نگار۔ایک تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر نیر جہاں، نگران ڈاکٹر صغرا مہدی ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی ۱۹۹۵ء

ایم۔اے:

دارالمصنفین،شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کی علمی، ادبی،تصنیفی خدمات کا جائزہ۔پروین خواجہ، غیر مطبوعہ، مقالہ برائے ایم،اے، أردو، اورینٹل کالج لاہور،۱۸۸ص

علامہ شبلی نعمانی۔عمدۃ النساء بیگم، غیر مطبوعہ، مقالہ برائے ایم،اے، أردو، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

شبلی پر مضامین/مقالات (رسائل میں):

''اسلامی فکری تشکیل جدید میں شبلی کا حصہ''۔عالم خوندمیری، صبا ،حیدرآباد: شبلی نمبر،۱۹۵۸ء،۴۷-۵۶ص

'' اصلاح تعلیم کی تحریک میں شبلی کا کردار''۔محمد نذیر کا کاخیل، فکر و نظر ،اسلام آباد: نومبر ۱۹۷۰ء، ۳۵۰-۳۵۸ص

اقبال اور شبلی۔محمد ریاض، ڈاکٹر، ماہ نو، لاہور: مئی ۱۹۷۷ء،۲۰-۲۳ص

"الفاروق پر ایک نظر"۔ تاج الدین طپش، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۲۵۹-۲۹۲ص
"الفاروق"۔ عطاءاللہ، شیخ، البصیر، چنیوٹ: شبلی نمبر، دسمبر ۱۹۵۷ء، ۷۶-۷۸ص
"الفاروق"۔ محمد اسلم جیراجپوری، شبلی کالج میگزین، علی گڑھ
"الفاروق"۔ محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی، معارف، علی گڑھ: جولائی ۱۸۹۹ء، ۶-۱۶ص
"الکلام مولانا شبلی پر ایک تنقیدی نظر"۔ عبدالماجد دریا بادی، الناظر، لکھنؤ: مارچ ۱۹۱۰ء، اپریل ۱۹۱۰ء، جون ۱۹۱۰ء، اگست ۱۹۱۰ء، اکتوبر ۱۹۱۰ء
"انشائے شبلی"۔ محمد بشیر چٹھہ، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۳۹۸-۴۰۲ص
"انشائے شبلی"۔ ناظر کاکوروی، فروغ اُردو، لکھنؤ: ستمبر ۱۹۵۹ء
"اُردو کے انشاء پرداز: شبلی نعمانی"۔ محمد عبداللطیف صدیقی، الناظر، لکھنؤ: ضمیمہ جولائی ۱۹۲۷ء
"اُردو کے عناصر اربعہ میں علامہ شبلی کا درجہ"۔ سعید انصاری، الناظر، لکھنؤ: اپریل، مئی ۱۹۲۵ء
"اُردو میں تنقید کا ارتقا"۔ محمد عبدالقیوم حسرت نعمانی، نگار، لکھنؤ: فروری، مارچ ۱۹۴۶ء، ۸۲-۱۲۶ص
"بازگواز نجد و یارانِ نجد: ندوۃ العماء اور علامہ شبلی نعمانی"۔ ابوعلی اعظمی، فاران، کراچی: مئی ۱۹۷۰ء، ۳۳-۴۵ص
"برصغیر پاک و ہند کے علمی و ادبی اور تعلیمی ادارے"۔ محمد اویس گوہر، حصہ اول، مجلہ علم و آگہی، نیشنل کالج کراچی، ۱۷۵-۱۸۳ص
"پیش لفظ"۔ عبدالماجد دریا بادی، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ۱۹۶۰ء، ۷-۱۱ص
"تبصرہ مجموعہ نظم شبلی"۔ ذکاءاللہ، علی گڑھ گزٹ، علی گڑھ: ستمبر ۱۸۹۳ء
"تصانیف شبلی کا کلامی سلسلہ اور علم کلام کی تشکیل نو۔ محمد ریاض، ڈاکٹر، الولی، حیدرآباد: فروری، مارچ ۱۹۷۸ء، ۵-۲۰ص
"تنقید شعرالعجم پر ایک نظر"۔ ادارہ، برہان، دہلی: فروری ۱۹۴۴ء
"تنقید 'الکلام' کی اصلاح"۔ عطا محمد، الناظر، لکھنؤ: جولائی ۱۹۱۰ء، ستمبر ۱۹۱۰ء، نومبر ۱۹۱۰ء
"تنقید 'الکلام' پر مختصر خیالات"۔ عبداللہ یوسف علی، علامہ، الناظر، لکھنؤ: مئی ۱۹۱۰ء
"حالی اور شبلی کا سوانحی دور"۔ شاہ علی، ڈاکٹر سید، اردو، کراچی: اپریل ۱۹۵۶ء
"حالی اور شبلی کے ہاں تنقیدی اصلاحات"۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، ادبی دنیا، لاہور: اپریل ۱۹۴۷ء، ۲۹-۳۷ص
"حاؔلی اور شبلی سوانح نگار کی حیثیت سے"، نگار، لکھنؤ: اگست ۱۹۵۶ء، ۶-۱۵ص
"حاؔلی اور شبلی سوانح نگار کی حیثیت سے"، نگار، لکھنؤ: جولائی ۱۹۵۶ء، ۱۶-۳۱ص
"حاؔلی اور شبلی سوانح نگار کی حیثیت سے"، نگار، لکھنؤ: ستمبر ۱۹۵۶ء
حیات شبلی اور مولانا سہیل (اقبال احمد خان)۔ عقیدت مند، فاران، کراچی: اگست ۱۹۵۷ء، ۱۵-۲۱ص

''حیاتِ شبلی پر ایک نظر''۔محمد ابراہیم ڈار، **نوائے ادب**، بمبئی: جنوری ۱۹۵۰ء، ۲۲۔۵۷ص
''حیاتِ شبلی کی معلومات میں کچھ اضافے''۔محمد ابراہیم فریدی، **معارف**، اعظم گڑھ: اکتوبر ۱۹۴۸ء، ۳۱۳۔۳۱۵ص
''حیاتِ شبلی''۔زینت ساجدہ، **صبا**، حیدرآباد: شبلی نمبر، ۱۹۵۸ء، ۱۱۔۲۰ص
''خالد صاحب اور علامہ شبلی کتاب''۔وحید قریشی، ڈاکٹر، **کتاب**، لاہور: فروری ۱۹۶۷ء
''خلاصہ حیات شبلی کا ایک تاثر''۔ابوعلی اعظمی، **فاران**، کراچی: فروری ۱۹۶۴ء، ۲۴۔۲۷ص
''دار المصنفین اعظم گڑھ''۔محمد اویس گوہر، **مجلہ علم و آگہی** نیشنل کالج کراچی
''دار المصنفین: شبلی کی تصنیفی تحریک''۔غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۲۰۳۔۲۰۹ص
''دار المصنفین اعظم گڑھ قلم بدست شہنشاہوں کا دربار''۔صباح الدین عبدالرحمٰن، **چٹان**، لاہور: ۲۲ فروری ۱۹۶۵ء، ۹۔۱۰، ۲۱۔۲۲ص
''دار المصنفین اور اُس کی خدمات''۔صباح الدین عبدالرحمٰن، **البصیر**، چنیوٹ: شبلی نمبر، دسمبر ۱۹۵۷ء، ۴۔۱۳ص
''دستہ گل و بوئے گل''۔عبدالسلام ندوی، **اردوئے معلی**، علی گڑھ: اکتوبر ۱۹۰۹ء، ۱۲۔۱۵ص
''دیباچہ سیرت شبلی''۔اقبال احمد خان سہیل، **الاصلاح**، سرائے میر: اکتوبر ۱۹۳۶ء، ۳۸۔۵۰ص
''دیباچہ سیرت شبلی''۔اقبال احمد خان سہیل، **الاصلاح**، سرائے میر: نومبر ۱۹۳۶ء، ۴۸۔۵۵ص
''دیوانِ شبلی''۔عبدالسلام ندوی، **اردوئے معلی**، علی گڑھ: اکتوبر ۱۹۰۹ء، ۶۶۔۶۷ص
''روزنامچہ مولانا شبلی نعمانی''۔سلیمان ندوی، سید، **معارف**، اعظم گڑھ: ستمبر ۱۹۱۸ء
''سفرنامہ روم و مصر و شام''۔عطاءاللہ، شیخ، **البصیر**، چنیوٹ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۵۷ء، ۶۷۔۷۸ص
''سفرنامہ مصر و روم و شام''۔محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی، **آزاد**، کانپور: ۱۷ اگست ۱۹۰۸ء
''سوانح مولانا روم: مولانا کے آئینہ تحقیق و تنقید میں''۔محمد ظفر خان، **البصیر**، چنیوٹ: شبلی نمبر، دسمبر ۱۹۵۷ء، ۳۱۔۴۷ص
''سوانح مولانا روم''۔محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی، **مخزن**، لاہور: اکتوبر ۱۹۰۶ء
''سیرت شبلی''۔اقبال احمد خان سہیل، **الاصلاح**، سرائے میر: جنوری ۱۹۳۷ء، ۴۲۔۵۱ص
''سیرت نگار شبلی کی دینی شاعری''۔محمد ریاض، ڈاکٹر، **فکر و نظر**، اسلام آباد: مارچ ۱۹۸۰ء، ۱۷۔۳۵ص
''شبلی اپنے خطوط کے آئینے میں''۔خالد حسن قادری، **نگار**، لکھنؤ: ۱۹۳۵ء
''شبلی اپنے خطوط کے آئینے میں''۔معین الدین ندوی، شاہ، **ادیب**، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۲۵۰۔۳۵۹ص
''شبلی اور ابوالکلام''۔ابوعلی اعظمی، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۱۷۲۔۱۸۸ص
''شبلی اور الکلام''۔معراج الدین احمد، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۳۶۹۔۳۸۲ص
''شبلی اور اُردو''۔ابواللیث صدیقی، **علی گڑھ میگزین**، علی گڑھ: جنوری ۱۹۳۹ء

"شبلی اور بمبئی"۔ نجیب اشرف ندوی، اسماعیل کالج میگزین، بمبئی
"شبلی اور جدید شاعری"۔ احمد عبداللہ المسدوسی، مجلّہ مکتبہ، حیدرآباد: جلد ۲، شمارہ ۶
"شبلی اور حالی کی تحریکیت"، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۳۵۴۔۳۶۰ص
"شبلی اور حالی"۔ عابد نظامی، سیارہ، لاہور: نومبر ۱۹۷۱ء، ۳۶۔۳۹ص
"شبلی اور حالی"۔ عابد نظامی، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۲۴۲۔۲۴۶ص
"شبلی اور ڈارون: ایک اہم خط"، دکن ریویو، حیدرآباد: ستمبر ۱۹۰۸ء
"شبلی اور سیاست"۔ احمد اسحاق نعمانی، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۳۶۱۔۳۶۹ص
"شبلی اور علی گڑھ تحریک"۔ حفیظ مینائی، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۲۳۳۔۲۴۱ص
"شبلی اور معاصر سیاسی حالات"۔ محمد ریاض، ڈاکٹر، المعارف، لاہور: جولائی ۱۹۷۹ء، ۱۷۔۲۷ص
"شبلی اور مہدی حسن"۔ عبدالاحد خان خلیل، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۳۴۳۔۳۴۹ص
"شبلی ایک تحریک"۔ سردار محمد، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۴۶۵۔۴۸۶ص
"شبلی ایک شاعر"۔ بشیر احمد، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۵۴۱۔۵۵۴ص
"شبلی ایک مصلح"۔ حسین ثاقب، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۶۳۹۔۶۴۲ص
"شبلی ایک نظم گو"۔ رفیق احمد خان، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۴۰۳۔۴۶۴ص
"شبلی ایک نقاد: مؤلفہ انیس و دبیر کی روشنی میں"۔ حیدر، آغا، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۴۸۷۔۴۹۵ص
"شبلی بحیثیت ادیب"۔ عبدالحئی، پروفیسر، البصیر، چنیوٹ: شبلی نمبر، دسمبر ۱۹۵۷ء، ۱۸۴۔۱۹۰ص
"شبلی بحیثیت انشاء پرداز"۔ ناصر حسین نقوی، سید، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۲۲۴۔۲۳۰ص
"شبلی بحیثیت سوانح نگار"۔ مقبول احمد خواجہ، نئی قدریں، حیدرآباد (پاکستان): نومبر ۱۹۵۶ء، ۱۲ص
"شبلی بحیثیت شاعر مؤرخ"۔ اختر وقار عظیم، فنون، لاہور: اپریل ۱۹۶۸ء، ۱۸۳۔۱۹۳ص
"شبلی بحیثیت صحافی: الندوہ کا اشاریہ"۔ عابد رضا بیدار، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۳۸۲۔۳۹۷ص
"شبلی بحیثیت مصنف"۔ بشیر احمد میاں، ہمایوں، لاہور: مئی ۱۹۳۰ء
"شبلی پر ایک نظر"۔ ظہور نسیم، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۵۸۴۔۶۰۱ص
"شبلی پر سرسید کا اثر: ایک جائزہ"۔ مرتضیٰ حسین بلگرامی، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۳۵۰۔۳۵۳ص
"شبلی۔ چوں بہ خلوت ی رود"۔ ابن فرید، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۲۶۸۔۳۰۳ص
"شبلی فکر جدید سے کیوں کر روشناس ہوئے؟"۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، اورینٹل کالج میگزین، لاہور: ۱۹۳۸ء، ۳۸ص
"شبلی کا ادبی مرتبہ"۔ ش، عباسی، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری، ۱۹۷۱ء، ۲۹۳۔۳۰۱ص،
"شبلی کا اسلوب بیان"۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر ستمبر ۱۹۶۰ء، ۳۳۱۔۳۴۹ص
"شبلی کا اسلوب بیان"۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۳۹۔۷۰ص

''شبلی کا اسلوب تحریر''۔مفتوں احمد صدیقی، خاور، ڈھاکہ: جولائی ۱۹۵۲ء

''شبلی کا اسلوب نگارش''۔سحر انصاری، مجلہ جناح کالج، کراچی: ۶۹۔۱۹۶۸ء، ۳۳۔۳۷ص

''شبلی کا اسلوب نگارش''۔آفتاب احمد صدیقی، خاور، ڈھاکہ: نومبر ۱۹۵۳ء

''شبلی کا انداز نگارش''۔شوکت رانا، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۶۰۲۔۶۰۶ص

''شبلی کا تحقیقی شعور''۔ارشد، اے، ڈی، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۳۲۳۔۳۴۴ص

''شبلی کا طرزِ تحریر''۔عبدالسلام ندوی، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ۱۹۶۰ء، ۱۸۶۔۱۹۲ص

''شبلی کا فارسی تغزل''۔رشید حسن خان، نگار، لکھنؤ: مئی ۱۹۵۰ء

''شبلی کا نظریہ تاریخ''۔عبداللہ، ڈاکٹر سید، معارف، اعظم گڑھ: مارچ ۱۹۳۸ء، اپریل ۱۹۳۸ء، ۲۸۱۔۲۹۳ص

''شبلی کا جرمِ محبت اور سلیمان ندوی۔محمد امین زبیری، نگار، لکھنؤ: اکتوبر ۱۹۴۵ء، ۴۹۔۵۱ص

''شبلی کی اردو شاعری''۔محمد ظفر وارا، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۲۱۰۔۲۳۲ص

''شبلی کی ایک یادگار: دارالمصنفین''۔کبیر احمد جائسی، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر ستمبر ۱۹۶۰ء، ۱۷۶۔۱۸۴ص

''شبلی کی تاریخِ رحلت اور اقبال''۔غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اُردو، کراچی: اپریل ۱۹۶۷ء، ۹۲۔۹۴ص

''شبلی کی تنقید نگاری''۔عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۲۰۸۔۲۱۷ص

''شبلی کی تنقید نگاری''۔عبادت بریلوی، ڈاکٹر، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۱۷۔۸۶ص

''شبلی کی ذوق آفرینی''۔مرتضیٰ حسین فاضل، سید، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۱۶۴۔۱۷۱ص

''شبلی کی رومانی زندگی''۔نواب علی، سید، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۳۰۴۔۳۰۶ص

''شبلی کی سوانح نگاری''۔مجیب اللہ ندوی، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۵۱۔۵۹ص

''شبلی کی سوانح نگاری''۔مجیب اللہ ندوی، الشجاع، کراچی: جولائی ۱۹۷۳ء، ۱۲۔۱۷ص

''شبلی کی سوانح نگاری''۔وحید قریشی، ڈاکٹر، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۱۰۴۔۱۰۹ص

''شبلی کی سوانح نگاری''۔وحید قریشی، ڈاکٹر، لفظ، لاہور: یونیورسٹی اورینٹل کالج، دسمبر ۱۹۷۲ء

''شبلی کی سیاسی شاعری پر ایک طائرانہ نظر''۔صدیق احمد صدیقی، ادبی دنیا، لاہور: اکتوبر ۱۹۵۳ء، ۲۲۔۴۸ص

''شبلی کی سیاسی شاعری پر ایک طائرانہ نظر''۔صدیق احمد صدیقی، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۱۶۸۔۱۷۵ص

''شبلی کی سیاسی شاعری''۔وقار عظیم، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۸۷۔۱۰۳ص

''شبلی کی سیرت النبیؐ''۔نذیر احمد خواجہ، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۳۴۵۔۳۶۸ص

''شبلی کی شاعری''۔خان رشید، قومی زبان، کراچی: جولائی ۱۹۷۶ء، ۱۹۔۲۲ص

''شبلی کی شخصیت اور ادبی کارنامے''۔ادریس احمد، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۵۵۵۔۵۶۲ص

''شبلی کی شعر فہمی اور شعر گوئی''۔رضیہ بیگم، صبا، حیدرآباد: شبلی نمبر، ۱۹۵۸ء، ۶۸۔۷۶ص

''شبلی کی فارسی شاعری''۔ظہیر احمد صدیقی، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۱۳۹۔۱۵۳ص
''شبلی کی فارسی غزلیں''۔عبدالسلام ندوی، ادیب، علی گڑھ، شبلی نمبر، ۱۹۶۰ء، ۱۴۱۔۱۴۸ص
'' شبلی کی قومی شاعری''۔اخلاق حسین عارف، آج کل ،دہلی: ستمبر ۱۹۶۷ء، ۲۵۔۳۲ص
''شبلی کی محرومیاں''۔احمد اسحاق نعمانی، علی گڑھ میگزین،علی گڑھ: ۱۹۵۷ء، شمارہ ا
''شبلی کے بارے میں چند غیر مطبوعہ اطلاعات''۔ محی الدین قادری زور، صبا، حیدرآباد: شبلی نمبر، ۱۹۵۸ء، ۳۳۔۳۹ص
''شبلی کے بعض نقاد''۔مفتوں احمد صدیقی، نگار ،لکھنؤ: اپریل ۱۹۵۷ء، ۲۱۔۲۴ص
''شبلی کے تصنیفی کام کی مجموعی قدر و قیمت''۔عبداللہ، ڈاکٹر سید، البصیر ، چنیوٹ: شبلی نمبر، دسمبر ۱۹۵۷ء، ۴۸۔۵۲ص
''شبلی کے سیاسی رجحانات''۔ علی جواد زیدی، ادیب، دہلی: ۱۹۴۳ء
''شبلی کے مذہبی افکار''۔سلمان ندوی، سید، کریسنٹ ،لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۱۷۔۲۳ص
''شبلی کے مضامین''۔سیدہ جعفر، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۲۱۸۔۲۲۳ص
''شبلی کے مطائبات''۔سعید اللہ شیخ، کریسنٹ ،لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۶۳۵۔۶۳۸ص
''شبلی کے مقاصد حیات''۔حمید کوثر، کریسنٹ ،لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۹۷ص
''شبلی کے مقالات کا مقام''۔ فاضل مشہدی، صحیفہ ،لاہور: جنوری ۱۹۶۳ء، ۲۷۔۳۸ص
''شبلی مکاتیب کے آئینے میں''۔خالد بزمی، کریسنٹ ،لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۵۰۴۔۵۴۰ص
''شبلی نعمانی کی اُردو فارسی شاعری''۔ محمد ریاض، ڈاکٹر، المعارف ،لاہور: اکتوبر ۱۹۷۴ء، ۱۸۔۲۳ص
''شبلی نعمانی کی سیاسی نظمیں''۔وزیر آغا، البصیر ، چنیوٹ: شبلی نمبر، ۱۹۵۷ء، ۶۱۔۶۷ص
''شبلی نعمانی کی شاعری''۔ماہر القادری، ماہ نو ،کراچی: اگست ۱۹۵۰ء، ۱۴۳۔۱۴۷ص
''شبلی نعمانی: حیات منیر''، عالم، شاہ، مسلم ریویو، الہ آباد: اگست ۱۹۱۲ء
''شبلی نعمانی''۔ریاض گل، کریسنٹ ،لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۶۱۷۔۶۲۰ص
''شبلی نعمانی''۔کلیم الدین احمد، کریسنٹ ،لاہور: شبلی نمبر جنوری ۱۹۷۱ء ۱۲۲۔۱۲۸ص
''شبلی نعمانی''۔ محمد ایوب قادری، العلم ،کراچی: اپریل تا جون ۱۹۶۷ء، ۳۳۔۳۸ص، جولائی تا ستمبر ۱۹۶۷ء، ۶۲۔۷۲ص، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۷ء، ۶۸۔۷۳ص
''شبلی و حالی کا ایک تقابلی مطالعہ''۔آفتاب احمد صدیقی، مہر نیمروز ،کراچی: نومبر ۱۹۵۶ء
''شبلی و حالی''۔عبدالمغنی، دانش ،علی گڑھ: نومبر ۱۹۵۹ء
''شبلی: ایک مجاہد کے روپ میں''۔ محمد حسین الدین دردائی، علی گڑھ میگزین ،علی گڑھ: جولائی ۱۹۳۷ء
''شبلی: عالمی ادیب اور شاعر''۔سعید انصاری، (رفیق دار المصنفین)، ادیب ،علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۱۹۳۔۲۰۷ص

''شبلی: انسان، مصنف، مصنف گو'' ۔عبدالماجد دریا بادی، **العلم**، کراچی: اپریل تا جون ۱۹۶۵ء، ۶۶۔۷۷ص
''شبلی: انسان، مصنف، مصنف گو'' ۔عبدالماجد دریا بادی، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۲۴۔۳۸ص
''شبلی: ایک عظیم مؤرخ'' ۔اختر وقار عظیم، **ماہ نو**، کراچی: نومبر ۱۹۶۷ء، ۹۔۱۴ص
''شبلی: ایک مثالی مصنف'' ۔عبدالعزیز کمال، **ادبی دنیا**، لاہور: اکتوبر ۱۹۶۹ء، ۲۱۔۳۵ص
''شبلی: شاعر اور نثر نگار'' ۔عبدالغفور طاہر، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر، ۱۹۷۱ء، ۶۲۱۔۶۲۵ص
''شبلی: ایک ہمہ گیر شخصیت'' ۔بخاری، ن، **نئی قدریں**، حیدرآباد: خاص نمبر، ۱۹۷۰ء، ۶۲۔۷۴ص
''شبلی، قائداعظم اور علامہ اقبال'' ۔افتخار حسین شاہ، سید، **ملتان یونیورسٹی میگزین**، ملتان: دانائے راز نمبر، ۱۹۷۷ء، ۱۴۔۱۹ص
''شبلی'' ۔عبداللہ العماوی، **زمیندار**، لاہور: ۱۳ نومبر ۱۹۱۴ء
''شبلی: ایک پین اسلامسٹ'' ۔عطاءاللہ، شیخ، **البصیر**، چنیوٹ: شبلی نمبر، دسمبر ۱۹۵۷ء، ۱۴۔۲۳ص
''شبلی: ایک ماہر تعلیم'' ۔غلام شبیر بخاری، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۱۳۸۔۱۴۳ص
''شبلی: جمالیات کے آئینے میں'' ۔محمد شریف بلال، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء
''شبلی: سلیمانی نگاہ میں'' ۔غلام محمد، مولانا، **ادیب**، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰، ۳۳۳۔۳۳۶ص
''شبلی: میری نظر میں'' ۔آل احمد سرور، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۱۱۰۔۱۲۱ص
''شبلی: ایک انسان'' ۔محمد کلیم، سید، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۶۲۶۔۶۳۴ص
''شبلی: ایک مؤرخ'' ۔غلام حسین، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۴۹۶۔۵۰۳ص
''شبلی: شخصیت اور خطوط'' ۔احراز نقوی، **ادیب**، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۲۶۰۔۲۶۷ص
''شبلی: مہدی افادی کی نظر میں'' ۔آفاق احمد، پروفیسر، **ادیب**، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۳۳۷۔۳۴۲ص
''شبلی: نثر کے میدان میں'' ۔افسرین خان، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۱۲۹۔۱۳۱ص
''شبلی۔ آفتاب احمد صدیقی''، **البصیر**، چنیوٹ: شبلی نمبر، دسمبر ۱۹۵۷ء، ۲۴۔۳۰ص
''شبلی'' ۔خورشید الاسلام، **کریسنٹ**، شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۱۴۴۔۱۶۳ص
''شبلی'' ۔صباح الدین عبدالرحمٰن، **نقوش**، لاہور: شخصیات نمبر، جنوری ۱۹۵۵ء، ۱۸۔۲۵ص
''شعرالعجم اور ذکر عرفی شیرازی'' ۔محمد ولی الحق انصاری، ڈاکٹر، **اُردو**، کراچی: اکتوبر ۱۹۶۷ء، ۶۹۔۱۰۳ص
''شعرالعجم اور عمر خیام'' ۔سلمان ندوی، سید، **معارف**، اعظم گڑھ: فروری ۱۹۲۴ء، ۸۲۔۱۱۰ص
''شعرالعجم اور عمر خیام'' ۔محمد اقبال، ڈاکٹر شیخ، **ہمایوں**، لاہور: جون ۱۹۴۴ء
''شعرالعجم پر ایک نظر'' ۔محمد اقبال، ڈاکٹر شیخ، **ادیب**، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۱۲۸۔۱۳۲ص
''شعرالعجم پر ایک نظر'' ۔محمد اقبال، ڈاکٹر شیخ، **ادبی دنیا**، لاہور: مئی ۱۹۴۵ء
''شعرالعجم: ایک مطالعہ'' ۔ماہر القادری، **ادیب**، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۱۰۷۔۱۲۷ص

''شعرالعجم''۔ آفتاب احمد صدیقی، **خاور**، ڈھاکہ: فروری ۱۹۵۲ء

''شعرالعجم''۔ نظام الدین دلگیر اکبرآبادی، **نقاد**، آگرہ: مارچ ۱۹۱۴ء، ۳۔۱۹ص

''عربی انشاء''۔ سعید انصاری، (رفیق دارالمصنفین)، **البصیر**، چنیوٹ: شبلی نمبر، دسمبر ۱۹۵۷ء، ۱۱۲۔۱۲۵ص

''عربی شاعری اور مثنوی: بہ نظر شبلی''۔ محمد عبدالباسط، **دکن ریویو**، حیدرآباد، دکن: فروری ۱۹۰۹ء

''عرفی کی داستان معاشقہ اور شبلی''۔ ابراہیم خلیل، **اُردو**، کراچی: ۱۹۶۹ء، شمارہ ۳، ۱۱۹۔۱۲۶ص

''علامہ شبلی اور حیدرآباد''۔ نصیر الدین ہاشمی، **صبا**، حیدرآباد: شبلی نمبر، ۱۹۵۸ء، ۴۰۔۶۱ص

''علامہ شبلی اور محمد علی''۔ محمد نعیم صدیقی، **جامعہ**، دہلی: مولانا محمد علی جوہر نمبر، اپریل ۱۹۷۹ء، ۱۱۰۔۱۱۳ص

''علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر''۔ احسان احمد علیگ، مرزا، **معارف**، اعظم گڑھ: فروری ۱۹۴۹ء، ۱۲۱۔۱۳۶ص

''علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر''۔ احسان احمد علیگ، مرزا، **معارف**، اعظم گڑھ: مئی ۱۹۴۹ء، ۳۸۱۔۳۹۲ص

''علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر''۔ احسان احمد علیگ، مرزا، **معارف**، اعظم گڑھ: اپریل ۱۹۴۹ء، ۲۷۵۔۲۹۱ص

''علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر''۔ احسان احمد علیگ، مرزا، **معارف**، اعظم گڑھ: مارچ ۱۹۴۹ء، ۲۰۳۔۲۱۷ص

''علامہ شبلی بحیثیت محقق و نقاد''۔ احسان احمد علیگ، مرزا، **ادیب**، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۳۶۔۵۰ص

''علامہ شبلی پر فتوئ تکفیر''۔ بدرالدین اصلاحی، **الاصلاح**، سرائے میر: اگست ۱۹۳۶ء

''علامہ شبلی کا نظریہ شاعری''۔ فیاض الدین حیدر، **صبح نو**، پٹنہ: مارچ ۱۹۶۰ء

''علامہ شبلی کی تصنیفات''۔ ممتاز منگلوری، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۲۴۷۔۲۵۸ص

''علامہ شبلی کی تیسری برسی''۔ سلمان ندوی، سید، **معارف**، اعظم گڑھ: نومبر ۱۹۱۷ء، ۲۹ص

''علامہ شبلی کے کارناموں کا ایک جائزہ''۔ عبدالکریم عابد، **چراغِ راہ**، کراچی: جون ۱۹۷۶ء، ۵۳۔۶۵ص

''علامہ شبلی کے نام مولانا ابوالکلام کے چند خطوط''۔ ابوعلی اعظمی، **نگار**، لکھنؤ: اکتوبر ۱۹۵۹ء، ۲۳۔۲۷ص

''علامہ شبلی نعمانی''۔ تمکین کاظمی، **صبا**، حیدرآباد: شبلی نمبر، ۱۹۵۸ء، ۲۱۔۲۳ص

''علامہ شبلی نعمانی''۔ جان میلکم، **خدا بخش لائبریری جرنل**، پٹنہ: شمارہ ۷۔۸، ۷۹۔۱۹۷۸ء، ۶۳۔۶۶ص

''علامہ شبلی: ہزار شیوہ ادیب''۔ ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر جنوری ۱۹۷۱ء، ۱۸۹۔۲۰۲ص

''علامہ شبلی: ایک نظر میں''۔ طارق محمود رانا، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۵۷۳۔۵۷۶ص

''علامہ شبلی: مؤرخ کی حیثیت سے''۔ ضیاء الدین فاروقی، **نگار**، کراچی: اکتوبر ۱۹۶۶ء

''علامہ شبلی، دارالمصنفین اور بھوپال''۔ محمد نعیم صدیقی، **فاران**، کراچی: اکتوبر ۱۹۶۸ء، ۲۵۔۲۹ص

''علامہ شبلی، مردم ساز''۔ عبداللہ اکوٹی ندوی، **فاران**، کراچی: اکتوبر ۱۹۶۸ء، ۲۵۔۲۹ص

''علامہ شبلی۔ ضیاء الدین احمد برنی''، **ادیب**، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۳۰۷۔۳۰۸ص

''علامہ شبلی۔ محمد اسماعیل ندوی''، **البصیر**، چنیوٹ: شبلی نمبر، دسمبر ۱۹۵۷ء، ۸۸۔۹۵ص

''علامہ شبلی''۔ محمد خالد، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۵۶۶۔۵۷۲ص

"علی گڑھ میں شبلی کا قیام"۔ مقتدی خان شروانی، البصیر، چنیوٹ: شبلی نمبر، دسمبر ۱۹۵۷ء، ۱۴۰۔۱۵۸ص
"غدر کے بعد قصیدہ نگاری اور مولانا شبلی"۔ محمود الٰہی، ڈاکٹر، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۱۳۶۔۱۴۰ص
"کسوف الشمسین"۔ احسن مارہروی، مشمولہ، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۳۰۳تا۳۱۶ص
"مثنوی صبح اُمید"۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۱۳۳۔۱۳۵ص
"محمد مہدی برادر صغیر شبلی کے مکاتیب لندن"۔ ابن فرید، ادیب، علی گڑھ: جولائی، اگست ۱۹۶۳ء، ۴۔۱۱ص
"مدرسۃ اصلاح اور علامہ شبلی"۔ امین احسن اصلاحی، الاصلاح، سرائے میر: اگست ۱۹۶۳ء
"مرحوم مولانا شبلی نعمانی: حیات علمی و ادبی پر ایک سرسری نظر"، ادارہ، البلاغ، کلکتہ: ۲۴/دسمبر ۱۹۱۵ء، ۷۔۸۱ص
"مرحوی علامہ شبلی نعمانی"۔ محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی، العلم، کراچی: جولائی تا ستمبر ۱۹۷۱ء، ۴۹۔۵۸ص
"مرحوی علامہ شبلی نعمانی"، محمد حبیب الرحمن خان شروانی، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ: ۲۰، ۲۷جنوری، ۱۹۱۵ء
"مرحوی علامہ شبلی نعمانی"۔ محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ۱۹۶۰ء، ۱۶۔۴۳ص
"مرزا دبیر اور کتاب 'المیزان'"۔ رضا علی، عابدی، ماہ نو، اسلام آباد: ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۵ء، ۱۴۰۔۱۸۱ص
"معرکہ انیس و دبیر: منظر و پس منظر"۔ انور سدید، سیارہ، لاہور: ستمبر ۱۹۷۸ء، ۵۷۔۶۶ص
"مفتون احمد اور شبلی"۔ احتشام احمد ندوی، نگار، لکھنؤ: جون ۱۹۵۷ء، ۳۲۔۳۵ص
"مقالات شبلی"۔ عبدالواحد، ابوظفر، صبا، حیدرآباد: شبلی نمبر، ۱۹۵۸ء، ۵۷۔۶۵ص
"مقالات شبلی"۔ عبیداللہ خان، البصیر، چنیوٹ: شبلی نمبر، دسمبر ۱۹۵۷ء، ۱۶۸۔۱۸۶ص
"مقالہ نما: مضامین الندوہ"۔ سلمان شمسی، معارف، اعظم گڑھ: اپریل ۱۹۷۲ء، ۳۰۵۔۳۱۴ص
"مقالہ نما: مضامین الندوہ"۔ سلمان شمسی، معارف، اعظم گڑھ: مارچ ۱۹۷۲ء، ۲۲۴۔۲۳۳ص
"مکاتیب عماد الملک بنام شبلی نعمانی"۔ عماد الملک، سید حسین بلگرامی، معارف، اعظم گڑھ: فروری ۱۹۶۵ء، ۱۴۸۔۱۵۶ص
"موازنہ انیس و دبیر پر ایک نظر"۔ آفتاب احمد صدیقی، خاور، ڈھاکہ: مئی ۱۹۵۲ء
"موازنہ انیس و دبیر: شبلی کی ایک تنقیدی کتاب"۔ احتشام حسین، ڈاکٹر سید، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۱۰۲۔۱۰۶ص
"موازنہ انیس و دبیر: شبلی کی ایک تنقیدی کتاب"۔ احتشام حسین، ڈاکٹر سید، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۱۲۹۔۱۳۷ص
"موازنہ انیس و دبیر"۔ احسن فاروقی، ساقی، کراچی: اپریل ۱۹۵۴ء
"موازنہ انیس و دبیر"۔ ظفر علی خان، دکن ریویو، حیدرآباد، دکن: اگست ۱۹۰۸ء
"مولانا شبلی اور ان کی شاعری"۔ محبوب الرحمٰن کلیم، معارف، اعظم گڑھ: دسمبر ۱۹۱۸ء، ۳۱۲۔۳۲۰ص

''مولانا شبلی اور ان کے منتقد اور معتقد''۔عبداللطیف اعظمی، **ادیب**، علی گڑھ: شبلی نمبر، ۱۹۶۰ء، ۶۹۔۹۹ص

''مولانا شبلی اور اُن کے سیاسی محرکات''۔مفتون احمد صدیقی، **مشرب**، کراچی: تاریخ اُردو ادب نمبر، ۱۹۵۶ء

''مولانا شبلی اور اُن کے سیاسی محرکات''۔مفتوں احمد صدیقی، **ادیب**، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۶۰۔۶۸ص

''مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی''۔عطیہ فیضی، بیگم، **ادبی دنیا**، لاہور: جون ۱۹۴۶ء

''مولانا شبلی اور علم کلام''۔سعید انصاری، (رفیق دارالمصنفین)، **ادیب**، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۲۶۔۳۵ص

''مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین پر غوغائے تکفیر''۔سلمان ندوی، سید، **الاصلاح**، سرائے میر: ۱۲ راگست ۱۹۳۶ء

''مولانا شبلی اور ندوۃ العلماء''۔مفتوں احمد صدیقی، **نگار**، لکھنؤ: مارچ ۱۹۵۳ء، ۲۷۔۳۰ص

''مولانا شبلی پر ایک نظر''۔غلام الثقلین، خواجہ، **عصر جدید**، میرٹھ: دسمبر ۱۹۶۴ء

''مولانا شبلی کی ابتدائی تحریر کا نمونہ''۔سلمان ندوی، سید، **معارف**، اعظم گڑھ: ستمبر ۱۹۱۸ء

''مولانا شبلی کی اُردو شاعری''۔سلام سندیلوی، ڈاکٹر، **ادیب**، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۱۵۴۔۱۶۷ص

''مولانا شبلی کی شاعری''۔ظفر احمد صدیقی، **جامعہ**، دہلی: اپریل ۱۹۸۰ء، ۲۱۵۔۲۳۷ص

''مولانا شبلی کی فارسی شاعری محی الدین احمد''، **صبا**، حیدرآباد: شبلی نمبر، ۱۹۵۸ء، ۷۷۔۸۴ص

''مولانا شبلی کی مقالہ نگاری''۔اطہر علی فاروقی، **آج کل**، دہلی: اگست ۱۹۵۱ء، ۴۷۔۵۰ص

''مولانا شبلی کی نازک مزاجی''۔محمد مقتدی خان شروانی، **ادیب**، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۳۲۳۔۳۲۶ص

''مولانا شبلی کیا تھے؟''۔صباح الدین عبدالرحمٰن، **البصیر**، چنیوٹ: شبلی نمبر، دسمبر ۱۹۵۷ء، ۱۹۱۔۱۹۴ص

''مولانا شبلی کے مختصر حالات زندگی: حجۃ الملت والدین حضرت علامہ شبلی نعمانی نعمدہ اللہ برقمہ''۔سلمان ندوی، سید، **معارف**، اعظم گڑھ: اگست ۱۹۱۶ء، ۱۲۔۲۵ص

''مولانا شبلی نعمانی کے اثرات ہماری زندگی پر''۔محمد عثمان، پروفیسر، **العلم**، کراچی: اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۹ء، ۷۱۔۷۵ص

''مولانا شبلی نعمانی دمغفور''۔عبداللہ خان بہادر، شیخ، **ادیب**، علی گڑھ: شبلی نمبر ستمبر ۱۹۶۰ء، ۳۱۴۔۳۲۲ص

''مولانا شبلی نعمانی دمغفور''۔عبداللہ خان بہادر، شیخ، **البصیر**، چنیوٹ: شبلی نمبر، دسمبر ۱۹۵۷ء

''مولانا شبلی نعمانی''۔افتخار الحسن، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۶۰۷۔۶۱۲ص

''مولانا شبلی نعمانی''۔سلیم پرویز مرزا، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۵۷۷۔۵۸۳ص

''مولانا شبلی نعمانی''۔صباح الدین عبدالرحمٰن، **ادیب**، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۳۷۰۔۳۷۶ص

''مولانا شبلی نعمانی''۔عبدالحکیم عامر، **کریسنٹ**، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۶۱۳۔۶۱۶ص

''مولانا شبلی نعمانی''۔عبدالقادر، شیخ سر، **اوراقِ نو**، لاہور: عبدالقادر نمبر، ۷۰۔۷۴ص

''مولانا شبلی نعمانی''۔محمد حبیب اللہ خان، **البصیر**، چنیوٹ: شبلی نمبر، دسمبر ۱۹۵۷ء، ۵۳۔۶۰ص

''مولانا شبلی نعمانی''۔محمد حبیب اللہ خان، **ادیب**، علی گڑھ: شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۳۰۹۔۳۱۳ص

''مولانا شبلی نعمانی''۔نیرنگ نیازی، **پیام حق**، کراچی: اپریل، مئی، ۱۹۷۱ء، ۱۸۔۲۳ص

''مولانا شبلی: ایک علیگ شاگرد کی نظر میں'' ۔طفیل احمد، سید، ادبی دنیا، لاہور: ۱۹۴۷ء

''مولانا شبلی: بابائے اردو کی نظر میں'' ۔عبداللطیف اعظمی، ادیب، علی گڑھ: شبلی نمبر، ۱۹۶۰ء، ۱۲۔۱۵ص

''مولانا شبلی: علی گڑھ سے پہلے اور بعد میں'' ۔مفتوں احمد صدیقی، نگار، لکھنؤ: جولائی ۱۹۵۶ء، ۴۳۔۴۶ص

''مولانا شبلی، مولانا آزاد، مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی: موزانہ'' ۔اسرار احمد، ڈاکٹر، چٹان، لاہور: مارچ ۱۹۷۴ء، ۲۳۔۲۶ص

''مولانا شبلی'' ۔خلیل احمد خلیل، کریسنٹ، لاہور: شبلی نمبر، جنوری ۱۹۷۱ء، ۵۵۳۔۵۶۸ص

''مولانا شبلی'' ۔عطیہ فیضی، بیگم، صبح اُمید، بمبئی: اپریل ۱۹۵۹ء

''مؤرخ شبلی'' ۔اختر وقار عظیم، اقبال، لاہور: اپریل ۱۹۶۸ء، ۷۶۔۹۱ص

''مینا بازار: وردِ کرشاران اُردو'' ۔اسرائیل احمد مینائی، نظام ادب، حیدرآباد: دسمبر ۱۹۴۲ء، ۳۱۔۶۹ص

''ندوۃ العماء اور علامہ شبلی نعمانی'' ۔ابوعلی اعظمی، فاران، کراچی: مئی ۱۹۷۰ء، ۳۳۔۴۶ص

''یادگار شبلی'' ۔نصیرالدین ہاشمی، ساقی، کراچی: فروری ۱۹۵۸ء، ۲۲۔۲۵ص

''یارِ سخن شناس (شبلی، اکبر کی نظر میں)'' ۔آفتاب احمد صدیقی، ادیب، علی گڑھ، شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ۳۲۷۔۳۳۲ص

شبلی پر مضامین رمقالات (کتابوں میں):

''اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں شبلی کا حصہ'' ۔عالم خوندمیری، مشمولہ شبلی ادیبوں کی نظر میں، مرتبہ محمد واصل عثمانی، کراچی: صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸ء، ۲۴۲۔۲۶۳ص

''اسلامی وقف علی اولاد کا مسودہ'' ۔پیسہ اخبار (روزنامہ)، مشمولہ قائد اعظم اور مسلم پریس، مرتبہ احمد سعید، جلد اول، لاہور: ایجوکیشنل ایمپوریم، ۱۹۷۶ء، ۱۴ص

''اقبال اور پیروی شبلی'' ۔افتخار حسین شاہ، سید، مشمولہ اقبال اور پیروی شبلی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء، ۹۔۳۹ص

''العلامہ شبلی بن حبیب اللہ الہندولی'' ۔عبدالحیٔ رائے بریلوی، سید، مشمولہ نزۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواقر (عربی کتاب)، کراچی: نور محمد اصح المطابع، ۱۹۷۶ء، جلد ششم، ۱۷۴۔۱۷۷ص

''الفاروق اور سرسید'' ۔محمد اسماعیل پانی پتی، شیخ، مشمولہ مقالات سر سید، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، جلد ہفتم، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء، ۳۲۲۔۳۲۸ص

''الفاروق'' ۔عطاءاللہ، شیخ، مشمولہ مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبیداللہ خان، ۱۵۸۔۱۶۰ص

''الفاروق'' ۔محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی، مشمولہ مقالات شروانی، علی گڑھ: شروانی پرنٹنگ پریس، س۔ن، ۳۳۔۴۸ص

''انشائے شبلی'' ۔شجاعت علی سندیلوی، مشمولہ شبلی نقادوں کی نظر میں، مرتبہ محمد واصل عثمانی، کراچی: صفیہ

اکیڈمی، ۱۹۶۷ء، ۷۵۔۸۶ص

''ایک ماہ''، جولائی ۱۹۱۴ء، مولانا شبلی کے ساتھ۔یحیٰ احمد ہاشمی، مشمولہ مقالات یوم شبلی، مرتبہ حافظ نذر احمد، ۶۲۔۷۷ص

''آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ''۔مہدی افادی، مشمولہ افادات مہدی، مرتبہ مہدی بیگم، لاہور: شیخ مبارک علی اینڈ سنز، طبع چہارم، ۱۹۴۹ء، ۸۷۔۱۰۱ص

''آزاد اور شبلی''۔محمد دین تاثیر، مشمولہ نثرِ تاثیر، مرتبہ فیض احمد فیض، بہاولپور: اُردو اکادمی، ۱۹۶۳ء، ۹۷۔۱۰۶ص

''تمدنِ عرب اور پروفیسر شبلی''۔مہدی افادی، مشمولہ افادات مہدی، مرتبہ مہدی بیگم، لاہور: شیخ مبارک علی اینڈ سنز، طبع چہارم، ۱۹۴۹ء، ۱۴۔۱۷ص

''تنقید شعرالعجم''۔محمود شیرانی، حافظ، مشمولہ مقالات محمود شیرانی جلد پنجم، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۰ء، ۱۔۲۶۶ص

''حالات شبلی''۔یحیٰ احمد ہاشمی، مشمولہ ادبی آئینے، کراچی: مکتبہ شاہد، ۱۹۷۴ء، ۶۵۔۱۱۸ص][

''حالی اور شبلی کا سوانحی دور''۔شاہ علی، ڈاکٹر سید، مشمولہ اُردو میں سوانح نگاری، کراچی: گلڈ اشاعت گھر، ۱۹۶۱ء

''حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک''۔مہدی افادی، مشمولہ افادات مہدی، مرتبہ مہدی بیگم، لاہور: شیخ مبارک علی اینڈ سنز، طبع چہارم، ۱۹۴۹ء، ۳۰۰۔۳۲۴ص

''حالؔی اور شبلؔی کا دور، معاصری تصانیف''، مشمولہ اُردو میں سوانح نگاری، کراچی: گلڈ اشاعت گھر، ۱۹۶۱ء، ۲۳۲۔۲۶۰ص

''حیات شبلی''۔زینت ساجدہ، مشمولہ شبلی ادیبوں کی نظر میں، مرتبہ محمد واصل عثمانی، کراچی: صفیہ اکیڈی، ۱۹۶۸ء، ۲۱۹۔۲۴۱ص

''خط بنام شبلی نعمانی''۔محمد اقبال، علامہ ڈاکٹر، مشمولہ اقبال نامہ، مرتبہ شیخ عطا اللہ، حصہ اول، لاہور: شیخ محمد اشرف، س۔ن، ۷۳۔۷۴ص

''دار المصنفین: شبلی کی تصنیفی تحریک''۔غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، مشمولہ مقالات یوم شبلی، مرتبہ حافظ نذر احمد، ۱۷۔۲۶ص

''دارالمصنفین اور اُس کی خدمات''۔صباح الدین عبدالرحمٰن، مشمولہ مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبید اللہ خان، ۱۷۲۔۱۸۳ص

''دستہ گل''۔الطاف حسین حالی، مشمولہ کلیات نثر حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، جلد دوم، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء، ۲۹۲۔۲۹۳ص

''سفرنامہ روم و مصر و شام''۔عطا اللہ، شیخ، مشمولہ مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبید اللہ خان، ۲۰۲۔۲۱۸ص

''سفرنامہ مصر و روم و شام''۔محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی، مشمولہ مقالات شروانی، علی گڑھ: شروانی پرنٹنگ

پریس،س۔ن،۳۰۔۳۳ص

''سوانخ مولانا روم: مولانا کے آئینہ تحقیق و تنقید میں''۔محمد ظفر خان،مشمولہ مقالات یوم شبلی،مرتبہ عبید اللہ خان، ۱۳۷۔۱۵۷ص

''سوانخ مولانا روم۔الطاف حسین حالی''،مشمولہ کلیات نثر حالی،مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، جلد دوم،لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۶۸ء،۲۷۴۔۲۷۵ص

''سیرت النعمان''۔الطاف حسین حالی،مشمولہ کلیات نثر حالی،مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، جلد دوم،لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۶۸ء،۲۱۰۔۲۱۶ص

''شبلی اپنے خطوط کے آئینے میں''۔معین الدین ندوی، شاہ،مشمولہ شبلی ،نقادوں کی نظر میں ،مرتبہ محمد واصل عثمانی،۸۷۔۹۵ص

'' شبلی اور ان کا فن سوانخ نگاری'' ۔الطاف فاطمہ،مشمولہ اردو ادب میں فنِ سوانح نگاری کا ارتقاء،کراچی: اُردو اکیڈی سندھ،۱۹۶۱ء،۱۰۹،۱۵۰ص

''شبلی اور دبیر''۔مسیح الزمان، مشمولہ تعبیر،تشریح،تنقید، الہ آباد: خیابان، ۱۹۵۵ء

''شبلی اور سرسید''۔عزیز ملک، مشمولہ خیابان ،۲،۷۴ص

''شبلی اور سیرت النبیؐ''۔عطاللہ، شیخ، مشمولہ مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبید اللہ خان، ۲۲۵۔۲۲۹ص

''شبلی بحیثیت مؤرخ ،سوانخ نگار، نقاد، مقالہ نگار''۔بخاری۔ ن، مشمولہ اشارات، میر پور خاص: پاک یونین سٹور پبلشرز ،۱۹۶۷ء

''شبلی سوسائٹی''۔مہدی افادی، مشمولہ افادات مہدی، مرتبہ مہدی بیگم،لاہور: شیخ مبارک علی اینڈ سنز ،طبع چہارم،۱۹۴۹ء، ۲۷۱۔۲۹۰ص

''شبلی کا اسلوب بیان''۔عبداللہ ،ڈاکٹر سید،مشمولہ بحث و نظر، لاہور: مکتبہ اُردو ،۱۹۵۲ء،۱۲۳۔۱۴۷ص

''شبلی کا اسلوب بیان''۔عبداللہ ،ڈاکٹر سید،مشمولہ ۱۹۵۱ء: بہترین ادب،مرتبہ چودھری برکت علی رمرزا ادیب، لاہور: مکتبہ اُردو ،۱۹۵۲ء، ۳۷۔۷۰ص

''شبلی کا اسلوب بیان''۔عبداللہ ،ڈاکٹر سید،مشمولہ بہترین مقالات،مرتبہ اختر جعفری، جلد اول، لاہور: مکتبہ اُردو، س۔ن،۵۵۵۔۵۶۸ص

''شبلی کا موازنہ: انیس و دبیر''۔مسیح الزمان، مشمولہ تعبیر،تشریح، تنقید، الہ آباد: خیابان، ۱۹۵۵ء،۵۰۔۶۰ص

''شبلی کی اردو شاعری''۔محمد بشیر مرزا،مشمولہ شبلی نقادوں کی نظر میں،مرتبہ محمد واصل عثمانی، کراچی: صفیہ اکیڈی ،۱۹۶۷ء، ۳۵۔۵۷ص

''شبلی کی تنقید نگاری''۔عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اُردو تنقید کے معمار، مرتبہ ایم۔حبیب خان، علی گڑھ: انڈین بک ہاؤس، ۱۹۶۵ء،۹۹۔۱۱۲ص

"شبلی کی تنقید نگاری"۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، مشمولہ **اُردو تنقید کا رتقاء**، دہلی: اُردو مرکز، ۱۹۶۴ء، ۱۷۱۔۱۸۸ص

"شبلی کی تنقید نگاری"۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، مشمولہ **مقالات یوم شبلی**، مرتبہ عبید اللہ خان، ۴۶۔۶۴ص

"شبلی کی ذوق آفرینی"۔ مرتضیٰ حسین فاضل، سید، مشمولہ **مقالات یوم شبلی**، مرتبہ حافظ نذر احمد، ۴۲۔۵۲ص

"شبلی کی سیاسی شاعری"۔ وقار عظیم، مشمولہ **مقالات یوم شبلی**، مرتبہ عبید اللہ خان، ۲۷۔۴۵ص

"شبلی کی فارسی شاعری"۔ احمد میاں اختر جونا گڑھی، مشمولہ **مقالات اختر**، کراچی: ترقی اُردو بورڈ، ۱۹۷۲ء، ۵۴۔۹۰ص

"شبلی کے بارے میں چند غیر مطبوعہ اطلاعات"۔ محی الدین قادری زورؔ، مشمولہ **شبلی ادیبوں کی نظر میں**، مرتبہ محمد داصل عثانی، کراچی: صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸ء، ۱۶۱۔۱۷۵ص

"شبلی کے تصنیفی کام کی مجموعی قدر و قیمت"۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، مشمولہ **مقالات یوم شبلی**، مرتبہ عبید اللہ خان، ۱۔۶ص

"شبلی کے قصائد کا تاریخی جائزہ"۔ یحیٰ احمد ہاشمی، مشمولہ **ادبی آئینے**، کراچی: مکتبہ شاہد، ۱۹۷۴ء، ۱۱۹۔۱۳۲ص

"شبلی مرحوم کا سوسالہ جشن ولادت"۔ عطاء اللہ، شیخ، مشمولہ **مقالات یوم شبلی**، مرتبہ عبید اللہ خان، ابتدائی چار صفحات

"شبلی مفکر و مبلغ"۔ عطاء اللہ، شیخ، مشمولہ **مقالات یوم شبلی**، مرتبہ عبید اللہ خان، ۲۱۹۔۲۲۳ص

"شبلی نعمانی کی سیاسی نظمیں"۔ وزیر آغا، مشمولہ **مقالات یوم شبلی**، مرتبہ عبید اللہ خان، ۱۲۲۔۱۲۹ص

"شبلی نعمانی"، مشمولہ **معاصرین**، کراچی: مجلس نشریات اسلام، س۔ن، ۶۶۔۷۱ص

"شبلی نعمانی"، ۔ شمس تبریز خان، مشمولہ **صدر یار جنگ**، لکھنؤ: مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، ۱۹۷۲ء، ۲۳۱۔۲۳۷ص

"شبلی نعمانی۔ رام بابو سکسینہ"، مشمولہ **تاریخ ادب اُردو حصہ نثر** مترجمہ مرزا، محمد عسکری، لکھنؤ: مطبع نولکشور، ۱۹۲۹ء، ۶۵۔۷۴ص

"شبلی نعمانی"۔ عبدالحلیم شرر، مشمولہ **مضامین شرر**، جلد سوم، لاہور: گیلانی الیکٹرک پریس بکڈپو، س۔ن، ۲۵۶۔۲۶۳ص

"شبلی نعمانی"۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، **اُردو دائرہ معارف اسلامیہ**، جلد یازدہم، لاہور: دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۵ء، ۶۵۰۔۶۵۴ص

"شبلی نعمانی"۔ عبدالماجد دریابادی، مشمولہ **معاصرین**، کراچی: مجلس نشریات اسلام، س۔ن، ۶۶۔۷۱ص

"شبلی نعمانی"۔ کلیم الدین احمد، مشمولہ **اُردو تنقید پر ایک نظر**، پٹنہ: دائرہ ادب بانکی، پور، س۔ن، ۱۰۸۔۱۱۸ص

"شبلی نعمانی"۔ کلیم الدین احمد، مشمولہ **اُردو تنقید پر ایک نظر**، لکھنؤ، ادارہ فروغ اُردو، ۱۹۵۷ء، ۱۱۲۔۱۲۰ص

"شبلی نعمانی"۔ محمد اکرام، شیخ، مشمولہ **ارمغانِ پاک**، لاہور: چاپ خانہ دین محمدی، س۔ن، ۱۳، ۲۳۰۔۲۳۵ص

''شبلی نعمانی''۔محمد باقر، آغا،مشمولہ تاریخ نظم و نثر اردو،لاہور: شیخ مبارک علی تاجر کتب،۱۹۴۲ء،۲۵۰۔۲۵۲ص
''شبلی نعمانی''۔نسیم قریشی، مشمولہ اُردو ادب کی تاریخ،لکھنؤ: ادارہ فروغ اُردو،۱۹۵۷ء،۶۱۰۔۶۴۷ص
''شبلی و حالی''۔محمد عبداللہ قریشی، مشمولہ معاصرین:اقبال کی نظر میں، لاہور: اقبال اکادمی ، ۱۹۷۷ء، ۸۲۔۹۱ص
''شبلی :انسان،مصنف،مصنف گر''۔عبدالماجد دریا بادی،مشمولہ شبلی ادیبوں کی نظر میں،مرتبہ محمد واصل عثمانی، کراچی: صفیہ اکیڈمی ،۱۹۶۸ء،۸۔۲۳ص
''شبلی :ایک مخالفِ انگریز''۔یحیٰ احمد ہاشمی،مشمولہ ادبی آئینے ،کراچی: مکتبہ شاہد،۱۹۷۴ء،۱۶۴۔۱۹۶ص
''شبلی ،ایک جامع الحیثیات شخصیت''۔عبداللہ،ڈاکٹر سید،، مقالات یوم شبلی ،مرتبہ حافظ نذر احمد، ۹۔۱۶ص
''شبلی ،موازنے کی روشنی میں''۔مسیح الزمان، مشمولہ تعبیر،تشریح، تنقید، الہ آباد: خیابان، ۱۹۵۵ء
''شبلی : ایک پین اسلامسٹ''۔عطاءاللہ، شیخ، مشمولہ مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبید اللہ خان، ۷۔۱۷ص
''شبلی : ایک ماہر تعلیم''۔غلام شبیر بخاری، مشمولہ مقالات یوم شبلی ،مرتبہ حافظ نذر احمد، ۳۵۔۴۱ص
''شبلی: میری نظر میں''۔آل احمد سرور، مشمولہ تنقید کیا ہے ؟،کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ،س۔ن،۷۳۔۹۱ص
''شبلی: میری نظر میں''۔آل احمد سرور،مشمولہ انتخاب آل احمد سرور،مرتبہ فقیر احمد فیصل،لاہور: لاہور اکیڈمی، س۔ن، ۷۶۔۹۴ص
''شبلی''۔اعجاز حسین،ڈاکٹر، مختصر تاریخ ادب اردو، کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ،۱۹۵۶ء،۳۲۲۔۳۲۵ص
''شبلی''۔اکرام الحق، شیخ، مشمولہ شعر العجم فی الھند،ملتان: شعبہ اشاعت الاکرام،۱۹۶۱ء،۳۷۹۔۳۹۴ص
''شبلی''۔آفتاب احمد صدیقی،مشمولہ مقالات یوم شبلی ،مرتبہ عبید اللہ خان، ۱۸۔۲۶ص
''شبلی''۔خورشید الاسلام،مشمولہ تنقیدیں،علی گڑھ:انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۷ء،۲۴۔۵۸ص
''شبلی''۔خورشید الاسلام،مشمولہ شبلی ادیبوں کی نظر میں،مرتبہ محمد واصل عثمانی، کراچی:صفیہ اکیڈمی ،۱۹۶۸ء،۱۲۷۔۱۶۰ص
''شبلی''۔سری رام، لالہ، مشمولہ خم خانہ جاوید،جلد چہارم، دہلی: ہمدرد پریس ،۱۹۲۶ء،۴۷۳۔۴۷۸ص
''شبلی''۔عبدالرزاق کانپوری، مشمولہ یاد ایام،حیدر آباد: عبدالحق اکیڈمی،۱۹۴۶ء،۶۰۔۱۲۷ص
''شبلی''۔عبدالقادر سروری، مشمولہ جدید اردو شاعری، لاہور: کتاب منزل ،۱۹۴۶ء،۱۰۲۔۱۱۰ص
''شبلی''۔عبداللہ ،ڈاکٹر سید، ، مشمولہ اشارات تنقید،لاہور: مکتبہ خیابان ادب ،۱۹۶۶ء، ۲۲۷۔۲۳۷ص
''شبلی''۔محمد یحیٰ تنہا،مشمولہ سیر المصنفین،حصہ دوم ، دہلی: مکتبہ جامعہ
''شبلی''۔ہارون الرشید، مشمولہ اُردو ادب اور اسلام ،جلد اول، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز ،۱۹۶۸ء، ۲۴۸۔۲۵۲ص
''شبلی''۔ہارون الرشید،مشمولہ اُردو ادب اور اسلام،حصہ دوم، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز ،۱۹۷۰ء،۴۴۔۴۹ص

''شعر العجم پر ایک فلسفیانہ نظر'' ـ مہدی افادی، مشمولہ افادات مہدی، مرتبہ مہدی بیگم، لاہور: شیخ مبارک علی اینڈ سنز، طبع چہارم، ۱۹۴۹ء، ۱۵۵ـ۱۷۰ص

''شمس العلماء شبلی نعمانی'' ـ محمد اکرام، شیخ، مشمولہ موجِ کوثر، لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، بار نہم، ۱۹۷۵ء، ۲۲۱ـ۲۴۸ص

''شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی'' ـ صغیر احمد جان، مشمولہ تنویر ادب، الہ آباد: نیشنل پریس، ۱۹۳۷ء، ۲۴۶ـ۲۴۹ص

''شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی ـ عبدالرشید، خواجہ، مشمولہ تذکرہ شعرائے پنجاب، کراچی: اقبال اکیڈمی، ۱۹۶۷ء، ۴۲۶ـ۴۲۷ص

''طلبہ میں سٹرائک اور بے چینی'' ـ ابو الحسن علی ندوی، مشمولہ حیاتِ عبدالحئی، دہلی: ندوۃ المصنفین، ۱۹۷۰ء، ۱۵۲ـ۱۸۰ص

''عربی انشاء'' ـ سعید انصاری، (رفیق دار المصنفین)۔ مشمولہ مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبید اللہ خان، ۱۰۴ـ۱۲۱ص

'' علامہ شبلی اور حیدر آباد ـ نصیر الدین ہاشمی''، مشمولہ شبلی ادیبوں کی نظر میں، مرتبہ محمد واصل عثمانی، کراچی: صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸ء، ۱۷۶ـ۱۹۰ص

'' علامہ شبلی اور مولانا سید عبدالحئی'' ـ ابو الحسن علی ندوی، مشمولہ حیاتِ عبدالحئی، دہلی: ندوۃ المصنفین، ۱۹۷۰ء، ۱۵۲ـ۱۸۰ص

'' علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر'' ـ احسان احمد علیگ، مرزا، مشمولہ مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبید اللہ خان، ۲۳۰ـ۲۹۸ص

''علامہ شبلی کا معتمدی سے استعفاء'' ـ ابو الحسن علی ندوی، مشمولہ حیاتِ عبدالحئی، دہلی: ندوۃ المصنفین، ۱۹۷۰ء، ۱۵۲ـ۱۸۰ص

'' علامہ شبلی کا ندوۃ العلماء'' ـ افتخار احمد چشتی، مشمولہ مقالات یوم شبلی، مرتبہ حافظ نذیر احمد، ۲۷ـ۳۴ص

'' علامہ شبلی کا دورِ معتمدی اور دار العلوم کا قیام'' ـ ابو الحسن علی ندوی، مشمولہ حیاتِ عبدالحئی، دہلی: ندوۃ المصنفین، ۱۹۷۰ء، ۱۵۲ـ۱۸۰ص

'' علامہ شبلی کی وفات'' ـ ابو الحسن علی ندوی، مشمولہ حیاتِ عبدالحئی، دہلی: ندوۃ المصنفین، ۱۹۷۰ء، ۱۵۲ـ۱۸۰ص

'' علامہ شبلی نعمانی'' ـ ابو اللیث صدیقی، مشمولہ اُردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ، کراچی: اُردو اکیڈمی، ۱۹۶۲ء، ۱۰۰ـ۱۰۸ص

'' علامہ شبلی نعمانی'' ـ اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی، مشمولہ مختصر تاریخ ادب اُردو، لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۳ء، ۳۴۷ـ۳۵۰ص

'' علامہ شبلی نعمانی'' ـ تمکین کاظمی، مشمولہ شبلی ادیبوں کی نظر میں، مرتبہ محمد واصل عثمانی، کراچی: صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸ء، ۱۹۱ـ۲۱۸ص

''علامہ شبلی''۔ ضیاء الدین احمد برنی، مشمولہ **عظمت رفتہ**، کراچی: تعلیمی مرکز، ۱۹۶۱ء، ۲۶۵۔۲۶۹ص
''علی گڑھ میں شبلی کا قیام''۔ محمد مقتدی خان شروانی، مشمولہ **مقالات یوم شبلی**، مرتبہ عبداللہ خان، ۸۰۔۱۰۳ص
''کیا مولانا آزاد علامہ شبلی کے شاگرد تھے؟''۔ ابوسلمان الہندی، مشمولہ **امام الہند**: تعمیر افکار، کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۶۲ء، ۲۵۴۔۲۷۹ص
''مثنوی صبح اُمید''۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، مشمولہ **شبلی نقادوں کی نظر میں**، مرتبہ محمد واصل عثمانی، کراچی: صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۷ء، ۹۷۔۱۰۵ص
''محمد شبلی نعمانی''۔ محمد فرمان، پروفیسر، **تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند**، جلد نہم، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء، ۱۷۳۔۲۰۷ص
''مرحوی علامہ شبلی نعمانی''۔ محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی، مشمولہ **مقالات شروانی**، علی گڑھ: شروانی پرنٹنگ پریس، س۔ن، ۱۶۷۔۱۷۹ص
''مسودہ وقف علی اولاد اور ندوۃ العلماء''۔ پیسہ اخبار (روزنامہ)، مشمولہ **قائد اعظم اور مسلم پریس**، مرتبہ احمد سعید، جلد اول، لاہور: ایجوکیشنل ایمپوریم، ۱۹۷۶ء، ۱۰اص
''مقالاتِ شبلی''۔ عبدالواحد، ابوظفر، مشمولہ **شبلی ادیبوں کی نظر میں**، مرتبہ محمد واصل عثمانی، کراچی: صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸ء، ۳۶۴۔۳۸۶ص
''مقالاتِ شبلی۔ عبداللہ خان، مشمولہ **مقالات یوم شبلی**، مرتبہ عبداللہ خان، ۱۸۴۔۲۰۱ص
''مکاتیب موج آئی: بنام مرزا احسان بیگ''، عظیم مرتضیٰ، عارف بٹالوی، سید امجد حسین، مرزا رفیق بیگ، حافظ محمد اشرف، عبدالحکیم اعظمی''، مسعود الحسن بھٹی، شیخ محمد یوسف، شیخ عطاءاللہ، عبداللہ خان، علی رضا خاں قزلباش، شیخ مسعود احمد بندولی، محمد انور نعمانی''۔ مرتبہ سعید انصاری، (رفیق دارالمصنفین)، لاہور: شبلی مرکز، س۔ن، ۲۶۴ص + ۲ص
''مکاتیب آزاد بنام شبلی''۔ ابوالکلام آزاد، **مکاتیب ابوالکلام آزاد**، مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری، کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۸ء، ۷۶۔۸۲ص
''ملک میں تاریخ کا معلم اول''۔ مہدی افادی، مشمولہ **افادات مہدی**، مرتبہ مہدی بیگم، لاہور: شیخ مبارک علی اینڈ سنز، طبع چہارم، ۱۹۴۹ء، ۱۸۰۔۱۸۸ص
''موازنہ انیس و دبیر''۔ رضا علی، سرسید، مشمولہ **اعمال نامہ**، دہلی: ہندوستانی پبلیشرز، ۱۹۴۳ء، ۵۰۔۶۲ص
''مولانا شبلی اور ترکی''۔ یحییٰ احمد ہاشمی، مشمولہ **ادبی آئینے**، کراچی: مکتبہ شاہد، ۱۹۷۴ء، ۱۵۱۔۱۶۳ص
''مولانا شبلی اُردو شاعر کے لباس میں''۔ سلمان ندوی، سید، مشمولہ **دیباچہ کلیات شبلی**، اُردو، اعظم گڑھ: معارف پریس، طبع چہارم: ۱۹۵۴ء، ۱۔۳۱ص
''مولانا شبلی کا تجدیدی کارنامہ''۔ عزیز ملک، مشمولہ **خیابان**، ۶۸۔۱۷۰ص
''مولانا شبلی کا مجوزہ دارالعلوم''۔ یحییٰ احمد ہاشمی، مشمولہ **ادبی آئینے**، کراچی: مکتبہ شاہد، ۱۹۷۴ء، ۱۹۷۔۲۳۶ص

''مولانا شبلی کی قومی شاعری''۔یحیٰ احمد ہاشمی، مشمولہ **ادبی آئینے**، کراچی: مکتبہ شاہد، ۱۹۷۴ء، ۱۳۳۔۱۵۰ص

''مولانا شبلی کیا تھے؟۔صباح الدین عبدالرحمٰن''، مشمولہ **مقالات یوم شبلی**، مرتبہ عبید اللہ خان، ۱۳۰۔۱۳۶ص

''مولانا شبلی کے حالات زندگی''۔قربان علی بسمل دہلوی، مشمولہ **مجموعہ نظم شبلی اُردو**، دہلی: شاہجہانی پریس ، باردوم، ۱۳۴۸ھ، ۹۷۔۱۰۴ص

''مولانا شبلی کے مختصر حالات زندگی: حجۃ الملت و الدین حضرت علامہ شبلی نعمانی نعمدہ اللہ برقمہ''۔سلمان ندوی ،سید، مشمولہ **یادر فتگاں**، کراچی: مکتبہ المشرق ،۱۹۵۵ء، ۹۔۲۷ص

''مولانا شبلی نعمانی دمغفور''۔عبداللہ خان بہادر، شیخ ،مشمولہ **مقالات یوم شبلی**، مرتبہ عبید اللہ خان، ۱۶۱۔۱۷۱ص

''مولانا شبلی نعمانی دمغفور''۔عبداللہ خان بہادر، شیخ ،مشمولہ **مشاہدات و تاثرات**، علی گڑھ: فیمیل ایجوکیشن ایسوی ایشن

''مولانا شبلی نعمانی''۔اسرار احمد سہاردی، مشمولہ **تعمیر ادب** ،لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت ،س۔ن، مرتبہ کوثر نیازی / عبدالحمید، ۶۶۔۷۹ص

''مولانا شبلی نعمانی۔حامد حسن قادری''، مشمولہ **داستان تاریخ اردو**، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، بار سوم، ۱۹۶۶ء، ۷۱۸۔۹۰۰ص

''مولانا شبلی نعمانی۔عبداللہ''، ڈاکٹر سید، مشمولہ **طیف نثر**، مرتبہ ممتاز منگلوری، لاہور: نذر سنز، ۱۹۶۴ء، ۱۸۱۔۱۹۲ص

''مولانا شبلی نعمانی۔عبدالوحید، ڈاکٹر''، مشمولہ **جدید شعرائے اُردو**، لاہور: فیروز سنز، س۔ن، ۳۳۔۳۴ص

''مولانا شبلی نعمانی۔محمد حبیب اللہ خان''، مشمولہ **مقالات یوم شبلی**، مرتبہ عبید اللہ خان، ۷۰۔۷۹ص

''مولانا شبلی :بابائے اردو کی نظر میں''۔عبداللطیف اعظمی، مشمولہ **شبلی ادیبوں کی نظر میں**، مرتبہ محمد داصل عثانی، کراچی: صفیہ اکیڈمی ،۱۹۶۸ء، ۱۱۵۔۱۲۲ص

''مولانا شبلی :بابائے اردو کی نظر میں''۔عبداللطیف اعظمی، مشمولہ **مشاہیر کے خطوط**، دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۵ء، ۳۴۔۴۱ص

'' مولوی محمد شبلی اعظم گڑھی۔رحمان علی، مولوی''، مشمولہ **تذکرہ علماء ہند**، مترجمہ محمد ایوب قادری، کراچی: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ،۱۹۶۱ء، ۴۳۶۔۴۳۷ص

'' ندوہ کا دور اختلاف و انتشار۔ابو الحسن علی ندوی''، مشمولہ **حیات عبدالحئی** ،دہلی: ندوۃ المصنفین ،۱۹۷۰ء، ۱۵۲۔۱۸۰ص

''ندوۃ العلماء اور شبلی نعمانی۔عبدالحلیم شرر''، مشمولہ **مضامین شرر**، جلد پنجم ، لاہور: ایس عبد الرشید اینڈ برادر، س۔ن، ۹۰۔۹۵ص

English Books

Abdul Qadir,Sir:Moulana Shibli Numani in his book, ***Famous Urdu***

Poets and Writers, Lahore: New Book Society ,N.D,pp.168-181

Browne, E.G:Shibli Naumani in his book "***A Literary History of Persia,*** Vol IV ,Cambridge:University Press, 1959,pp.164-165,241-269

Ghulam Mustafa Khan: Maulana Shibli Naumani in his book, ***Persian Literature in Indo-Pakistan Sub-continent,*** Lahore:Barque and Co,1972,pp.61

Ram Babu Saksena:Shibli Naumani in his book, ***History of Urdu Literature,*** Lahore:Sind Sagar Academy,1975,pp 287-294

Sadiq Husain, Dr.:The Aligarh Movement in his book, ***Urdu Literature,*** London:Oxford University Press,1964,pp.274-287

Mehr Afroz Murad: ***Intellectual Modernism of Shibli*** ,Lahore: Institute of Islamic Culture,1976,pp.135

Mohan Singh Dr.:Shibli in his book, ***Handbook of Urdu Literature*** ,pp.153-155

Rustamji Pistonji: ***Mulana Shibli and Umar Khayyam,*** Lahore: Al-Biruni, 1978,pp.118

شبلی۔مشرقی ادب کا نمائندہ

نثار ترابی

ABSTRACT:

Allama Shibli Naumani got his education and formal training under the patronage of Sir Syed Ahmad Khan where he became master in oriental and western sciences. He observed western culture very closely and after he made up his mind to save Muslim Ummah from evil impacts of this civilization through all of his faculties of pen and personality. After that, what ever he rendered and wrote, it carried oriental traditions and values. Through History, biography, Criticism, research and poetry like genres , Allama Shibli Naumani criticized very strictly all that is related to western mentality, its culture and civilization. He represented oriental culture and civilization, literature and conventions.

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ دنیا کا ادب دو واضح منطقوں میں تقسیم ہے۔ ایک مشرقی اور دوسرا مغربی۔دونوں منطقوں میں بڑے بڑے شعرا اور ادبا پیدا ہوئے۔مغربی شاعروں، افسانہ نگاروں اور ڈراما نویسوں نے بلاشبہ معیاری اور قابل قدر ادب تخلیق کیا۔لیکن مشرق میں بھی ادب کا معیار کسی طرح کم نہیں رہا۔البتہ مغرب کے نقادوں اور محققین نے مشرقی ادب کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دی اور ہمیشہ اپنے ادب کو ادب عالیہ تسلیم کروانے کے لیے کوششیں کرتے رہے۔مشرق کی چند ایک شخصیات کو تسلیم کیا گیا جن میں اردو کے حوالے سے سرِفہرست علامہ محمد اقبال ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اقبال سے پہلے اور اقبال کے بعد بھی ایسی شخصیات تھیں اور ہیں جن کے ادبی کارناموں نے مشرق و مغرب دونوں کو متاثر کیا۔ایسی ہی شخصیات میں علامہ شبلی نعمانی بہت زیادہ قابل ذکر ہیں۔ بہت زیادہ اس لیے کہ انھوں نے مغرب زدگی میں مشرقیت کی دستار سر سے نہیں اترنے دی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد سرسید کی علمی تحریک پر مغربیت پوری طرح حاوی تھی۔ اس تحریک سے ہٹ کر بھی عموی رویے

مغربیت کے زیراثر تھے اور اس میں عافیت سمجھی جاتی تھی۔ مغربیت کو اپنانا ایک فیشن بھی تھا اور مصلحت بھی۔ اس رجحان اور رویے کے برصغیر میں سب سے بڑے نمائندہ سرسید احمد خاں تھے جو مسلمانوں کو مغرب کی تقلید اور مغربی حکمرانوں کی بڑی حد تک غیر مشروط اور فرماں برداری کا درس دیتے رہے۔ بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی:

"انگلستان سے واپس پہنچ کر ایک طرف تو انھوں نے لندن کے پیغمبروں اور سویلیزیشن کے دیوتاؤں (یعنی اسٹیل اور ایڈیسن) کی تقلید میں 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا جس کا مقصد ہندوستانیوں کو کامل درجے کی سویلیزیشن سکھانا تھا۔ دوسری طرف ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کیا اور اگلے سال ملازمت سے پنشن لے کر انگریزوں سے انتہا درجے کی مربوبیت اور غرب زدگی کے ساتھ خود کو مدرسے کی ترقی کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی تمام تر اصلاحی اور تعلیمی کاوشوں کا مقصد مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا تھا جو ازروئے مذہب تو مسلمان ہو مگر بہ اعتبار ذوق و ذہن اور بلحاظ دل و دماغ انگریز ہو — وہ یہ اندازہ نہ کر سکے کہ انگریزی یا مغربی تعلیم صرف نوشت و خواند یا چند نئے مضامین کی تدریس اور انگریزی کی تحصیل تک محدود نہ تھی بل کہ اس تعلیم میں مذہب کا پورا فکر، پورا فلسفہ، پوری تہذیب و ثقافت اور پورا تمدن شامل تھا۔ جدید تعلیم زن کو نازن بنانے اور اس تعلیم کا تیزاب اپنے، اندر انسانی انا، اختیار اور خودی کو پگھلا کر موم بنانے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتا تھا"۔(۱)

سرسید کے ساتھ ساتھ شبلی کا تعلق باپ اور بیٹے یا استاد اور شاگرد جیسا تھا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ انھوں نے سرسید سے بہت کچھ سیکھا۔ بقول شیخ اکرام:

"مولوی محمد شبلی نعمانی بہ عمر ۲۶ سال اسسٹنٹ پروفیسر ہو کر علی گڑھ پہنچے تو ۶۷ برس کے سید احمد خاں ان کے لیے بہ منزلہ ایک شفیق باپ کے تھے۔ سرسید نے شبلی کو ایک ہونہار بیٹا سمجھ کر ان کے قیام کا انتظام اپنی کوٹھی کے احاطے میں کر دیا"۔ (۲)

سرسید احمد خاں کی شفقت، محبت اور توجہ نے محمد شبلی کو علامہ شبلی نعمانی بنایا کیوں کہ علی گڑھ میں انھیں مطالعے کے لیے بہت زیادہ وقت اور سہولت دستیاب تھی۔ انھوں نے اس سے بھرپور استفادہ کیا۔ شبلی بہت محنتی اور جان مار قسم کے انسان تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو آگے بڑھانے اور اپنی علمی ترقی کے لیے کماحقہٗ محنت اور مشقت کو شعار بنایا۔ اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ اگر شبلی کو سرسید کی صحبت اور علی گڑھ کی فضا میسر نہ آتی تو وہ اتنے نام ور محقق اور ادیب نہ بن سکتے۔ اس حقیقت کا اعتراف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"سید صاحب نے اپنے کتب خانے کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے۔ سید صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیہ، عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں جن کی حقیقت میں کیا، بڑے بڑے لوگ بھی نہیں جانتے ہوں گے مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں"۔ (۳)

یہی وہ کتابیں تھیں جن کے مطالعے سے شبلی شمس العلما بنے اور بعد ازاں ایک بہت بڑے علمی ادارے ''ندوۃ العلما'' کے بانی قرار پائے۔ علامہ شبلی کو سرسید کے قریبی ساتھیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شبلی بلاشبہ سرسید کے چار یاروں میں وہ شامل ہیں۔ دیگر تین مصلحین مولانا آزاد، مولانا حالی اور مولانا نذیر احمد کے ساتھ اگر شبلی نعمانی کا نام نہ آئے تو یہ گلدستہ علمی مکمل نہیں ہوتا۔ ان تمام حقائق کے باوجود ایک وقت ایسا آیا کہ علامہ شبلی نعمانی، ذہنی، روحانی، مذہبی اور ادبی لحاظ سے سرسید احمد خاں کے سب سے بڑے مخالف قرار پائے۔ شبلی کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوگئی کہ سرسید کی ساری کوششوں اور کاوشوں کا مقصد محض مغربیت کا فروغ ہے۔ وہ مغربی تہذیب کے دلدادہ ہو چکے ہیں۔ اپنی سرکاری قدرومنزلت میں اضافے کے لیے وہ اپنے مذہب اور روایات کو خیرباد کہنے میں تامل نہیں کرتے۔ وہ برملا کہنے لگے کہ سرسید کا ادارہ بی۔اے کی ڈگریوں کا کارخانہ ہے جن کے عوض نئی نسل کو اپنے اسلاف کی روایات کا سودا کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال شبلی اس ادارے اور سرسید کے نظریات سے بہت دور چلے گئے۔ شبلی کے اندر ایک سچا اور راسخ العقیدہ مسلمان سانس لے رہا تھا۔ وہ قطعاً نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی تہذیب وثقافت کے عوض انگریزی تعلیم کی آڑ میں مغربی تہذیب وثقافت میں ڈوب جائیں۔ لہٰذا انھوں نے مشرقی اقدار کو فروغ دینے اور اسلامی تہذیب وتمدن کے احیا کے لیے لکھنؤ میں ندوۃ العلما کی بنیاد رکھی اور اس ادارے کے ذریعے انھوں نے علما کی ایک کھیپ تیار کی۔ جنھوں نے تحقیق وتصنیف کے میدان میں قابلِ ذکر کارنامے انجام دیے۔

شبلی سرسید کی حمایت میں سب سے بڑے عالم دین کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا انداز تحریر خالص تحقیقی اور توضیحی تھا۔ انھوں نے مشرق کی ان اقدار کو اُجاگر کرنے کا بیڑا اٹھایا جن کا تعلق اسلام کی عظمت وشوکت سے تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے سیرۃ النبیؐ پر قلم اٹھایا اور اس کی نسبت سے مسلمانوں کے قرونِ وسطیٰ پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس کتاب کے ذریعے انھوں نے علمی وادبی تحقیق کے قابلِ عمل اصول وضع کیے اور اس کے ساتھ ساتھ مغربی ادیبوں اور نقادوں کے متعدد اعتراضات اور سوالات کے محققانہ جوابات دیے۔ اس حوالے سے ایک جگہ رقم طراز ہیں:

> ''یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے۔ ان کے ایک ایک حرف کے لیے سیکڑوں ورق الٹنے پڑتے ہیں۔ یہ کم بخت لکھتے تو جھوٹ ہیں لیکن بے پتا نہیں لکھتے۔ یہاں ہمارے سیرت نگاروں نے خود بہت بے احتیاطیاں کی ہیں''۔ (۶)

تاریخ کے ضمن میں انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس میں تاریخی حقائق کی توضیح وتوجیہ کے ساتھ ساتھ مستشرقین کے لیے خاص مواد بھی فراہم کیا جس سے ان کے دل و دماغ کی صفائی مقصود تھی۔ اسلامی مشاہیر کے کارنامے بیان کرتے ہوئے بھی انھوں نے یورپی مصنفوں کے خلاف مدافعانہ اور جارحانہ دونوں طرح کا انداز اختیار کیا۔ انھوں نے مخالفین کی تحریر کا مدلل جواب دیا اور اس انداز سے کہ مخالفین متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بقول سید سلیمان ندوی:

> ''ایسے ہوش مند حریفوں کے مقابلے کے لیے ساری دنیا کے اسلام میں سے جو شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ شبلی ہی تھے۔ انھوں نے انھی کی طرح سے ان ہی کے

اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض و برکت کی فرح بخش ہواؤں نے دنیا کے علم و تمدن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مردہ علوم میں کیونکر اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈالی"۔(۵)

اس طرح مولانا شبلی نعمانی نے ہر مقام اور ہر سطح پر یورپی نقادوں اور تاریخ نویسوں کے اعتراضات کو مسترد کرتے ہوئے حقائق سے پردہ اٹھایا اور اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کی حقیقی تصویر پیش کی۔ اس طرح مشرق کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔شبلی بیک وقت ایک مورخ، ایک نقاد، ایک سوانح نگار، ایک شاعر اور سفرنامہ نگار تھے۔ انھوں نے تاریخ لکھی تو مشرق کی روایات و تمدن کو سامنے رکھا۔ انھوں نے تنقید نگاری کی تو مشرق کی شعری مسلمات کا حقیقی معنوں میں تعارف کروا دیا اور ایک ایسی معرکہ آرا تصنیف سامنے لائے جو **شعر العجم** کے نام سے آج بھی مختلف جامعات میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے پوری فارسی شاعری کی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ شاعری کے محاسن و معایب پر تفصیلی بحث بھی کی گئی۔

سوانح نگاری میں علامہ شبلی نے ایسی شخصیات کا انتخاب کیا جو اسلام کے حقیقی ہیرو اور مشرق کے مثالی حکمران تھے۔ ان کی شاعری کے موضوعات کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مشرق کے خلاف مغرب کی سیاسی چالوں اور ریشہ دوانیوں پر قلم اٹھایا ہے۔ مختلف مشرقی ممالک بہ شمول ہندوستان پر ہونے والے مظالم کو شاعری کا موضوع بنا کر انھوں نے دنیا کے انصاف پسندوں کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ ترکی، قبرص، طرابلس، بلقان وغیرہ کے مسائل کو منظم کیا، سفرنامے کا مقصد بھی یہی تھا کہ مشرق و مغرب کی روایات کا تقابلی جائزہ لیں۔ انھوں نے اپنے سفر میں مشرق کے آئینے میں مغرب کا حقیقی چہرہ دیکھا اور اس چہرے کے خدوخال کو نئے الفاظ میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی۔ الغرض انھوں نے جس صنفِ ادب کو اپنایا اسے مغرب کے خلاف ایک موثر آواز میں تبدیل کر دیا۔ بہ قول ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی:

> "مغرب کے خلاف آواز اٹھانے والوں محض اکبر اور اقبال کا نام لے لینا اور شبلی کو نظرانداز کر دینا شبلی کے ساتھ زیادتی ہو نہ ہو انصاف کے ساتھ انصاف ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں تک مشرق اور مغرب آمیزش اور آویزش کا تعلق ہے غور کیجیے اور انصاف سے کہیے تو یہی کہنا پڑے گا کہ اکبر، اقبال اور شبلی تینوں ایک ہی جذبے سے سرشار ایک ہی منزل کی طرف رواں ہیں"۔(۶)

شبلی کی تصانیف، تقاریر اور نظریات وعقائد کے پیشِ نظر مولانا الطاف حسین حالی نے انھیں مشرقی ادب اور تہذیب کا حقیقی نمائندہ قرار دیتے ہوئے ان الفاظ میں اعترافِ حقیقت کیا:

ادب اور مشرقی، تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلی سا وحیدِ عصر و یکتائے زمن دیکھیں

حوالے:

۱۔ ہاشمی، رفیع الدین، ڈاکٹر، سرسید، "شبلی اور مغرب"، مضمون مشمولہ صحیفہ لاہور، جولائی، دسمبر ۲۰۱۴ء، ص ۵۹۹۔

۲۔ شیخ محمد اکرام یادگارِ شبلی، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۱ء، ص ۹۷۔

۳۔ شبلی نعمانی، علامہ، مکاتیب شبلی جلد اوّل (مرتبہ) سید سلیمان ندوی، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۰۸ء، ص ۵٦-۵۷۔

۴۔ شبلی نعمانی، علامہ، سفر نامہ روم و مصروشام، آگرہ ۱۸۹۴ء، ص ۲۔

۵۔ ندوی، سید سلیما، حیات شبلی، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء، ص ۲۵۔

٦۔ آفتاب احمد صدیقی، ڈاکٹر، "بارِ سخن شناس"، مضمون مشمولہ صحیفہ، لاہور، جولائی دسمبر ۲۰۱۴ء، ص ۲۔

حالی و شبلی کی تنقید اور عصری شعور

محمد امجد عابد

ABSTRACT:

"Consciousness of contemporary age" significantly contains depth so far as its actual meanings are concerned. It is such a feeling that occurs because of social changes that influence mind and heart of a creator and indirectly comes under the discussion of a critic. Hali is founder of modern Urdu criticism. He is the first critic to have developed critical theories and principles and related poetry with society. His criticism is not the Sheer product of social theories but it fulfils the social needs of his age. He put a critical eye on social life of his age and suggested amendments to improve it. The second important critic of the same time is Maulana Shibli Noumani. He also stressed upon collective and social point of view in criticism. He probed into the social and socital issues that had impacts on literature. He tried to coup with these issues following his contemporary consciousness.

''عصر'' کے لفظ میں ایک خاص زمانے یا عہد کا تصور پایا جاتا ہے۔ یعنی ایسا زمانہ جو اپنی حدود رکھتا ہے اور رواں دواں وقت میں کہیں ایک عہد موجود کی صورت میں اپنا وجود رکھتا ہے۔ ''شعور'' کا لفظ 'ادراک یا آگہی' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ شعور' احساس کو بھی کہتے ہیں۔ جس کے ذریعے ہمیں اپنے ماحول' گرد و پیش اور حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ تو ''عصری شعور'' سے مراد کسی بھی عہد، زمانے یا وقت کی مختلف حالتوں کے بارے میں مکمل آگاہی اور علم رکھنا ہے۔ زمانے یا عہد کی یہ حالتیں سیاسی، سماجی، تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، معاشی اور اقتصادی ہو سکتی ہیں۔ عصری شعور کا دائرہ کار بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے اور یہ زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ''عصری شعور' ایک کُل ہے جس کے مختلف اجزاء ہیں۔ مثلاً سماجی، تمدنی، اخلاقی، تعلیمی، سیاسی، معاشرتی، معاشی، تاریخی، ذاتی، نفسیاتی، تہذیبی، مذہبی، سائنسی و دیگر۔ درج بالا شعبہ ہائے زندگی کے

بارے میں شعور حاصل کر کے ہم ایک کُل یعنی ''عصری شعور'' میں داخل ہوتے ہیں۔ زمانے یا وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ عصری شعور میں تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے اور یہ تغیر پذیر رہتا ہے۔ ایک نقاد کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے عہد کی صورت حال کا مشاہدہ اور مطالعہ کر کے ''روحِ عصر'' تک پہنچ جائے اور اس کی روشنی میں ادب یا تخلیق کے مطالعہ سے اس کیفیت یا صورت حال کو جان لے جس سے ایک تخلیق کار دو چار ہو رہا ہے۔ لہٰذا نقاد کو ''عصری شعور'' سے بہرہ ور ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ ''عصری شعور'' سے خالی اور سماجی طرزِ احساس سے عاری تخلیقات، تخلیق کار کی سوچ کو محدود اور فکر کو تنگیٔ داماں کا اسیر بنا دیتی ہیں۔ اور انہیں قبولِ عام کی سند حاصل نہیں ہو سکتی۔

اردو تنقید اپنے آغاز ہی سے عصری شعور اور سماجی ادراک کو اپنے ہمرکاب لے کر چلی ہے۔ اس وقت بھی جب تنقید کی کوئی باقاعدہ شکل موجود نہیں تھی اور ہم مختلف لوگوں کے ترتیب دیے ہوئے تذکروں ہی میں تنقیدی نکات تلاش کرتے ہیں۔ تذکرے باقاعدہ تنقید کی ذیل میں تو نہیں آتے لیکن ان کی ترتیب میں اور شعرا کی فہرست سازی میں اس تنقیدی شعور کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس نے شعرا کے انتخاب اور ان کے کلام کے چناؤ میں اہم کردار ادا کیا۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جب بھی کوئی تذکرہ نگار تذکرہ مرتب کرتا ہے تو بعض بنیادی اور اہم باتیں اس کے ذہن میں موجود ہوتی ہیں مثلاً اس کے نزدیک شعرا کے انتخاب کا معیار کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے منتخب کردہ شعرا کس حد تک اس کے معیار پر پورے اترتے ہیں اور سب سے اہم یہ کہ وہ کس حد تک اپنے عہد کے طرزِ احساس سے وابستہ ہیں۔ وہ شاعری میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا کس حد تک ادراک رکھتے ہیں اور پھر یہ کہ وہ کس حد تک اپنے عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہیں۔ یہی بات عصری شعور کے ذیل میں آتی ہے اور ایک نقاد بھی پوری طرح اس احساس سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ تذکروں کے مقام سے گزر کر مولانا الطاف حسین حالی تک پہنچتے پہنچتے اردو تنقید بے ربطی اور غیر منظم شدہ صورتحال سے ایک مربوط اور جامع شکل اختیار کرتی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اس صورت حال کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سماجی زندگی میں (جو) تغیرات ہوئے ان کے اثرات تنقید پر بھی پڑے اور اس نے بھی اپنے اندر ایک انقلابی کیفیت پیدا کی......ادب کے معنوی پہلو کی طرف تنقید نے زیادہ توجہ کی۔ اس نے ادب کو الہامی، ماورائی اور مابعد الطبیعاتی چیز نہیں سمجھا بلکہ اس بات پر زور دیا کہ ادب سماجی زندگی کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں ان پہلوؤں کا سمویا جانا ضروری ہے جو سماجی اعتبار سے وقت کا تقاضا ہوں۔'' (۱)

یہ بات صرف تخلیقی ادب پر ہی صادق نہیں آتی بلکہ تنقید بھی جب ایسی تخلیقات کا جائزہ لیتی ہے تو نقاد کو ذہنی طور پر خود کو اس بات کے لیے تیار رکھنا پڑتا ہے کہ وہ سماجی حالات اور وقت کے تقاضوں کو کس تناظر میں سمجھتا ہے اور اس کے نزدیک سماجی شعور اور وقت کا ادراک کس حد تک ضروری ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے جس نقاد نے اس طرف توجہ کی وہ مولانا الطاف حسین حالی ہیں۔ جنھیں شائد اسی وجہ سے اردو کا پہلا نقاد کہا جاتا ہے۔ حالی نے

پہلی بار عملی تنقید سے زیادہ نظری مباحث کو اہمیت دی اور جو اصول و قوانین تنقید کے لیے وضع کیے ان میں اس بات کو اولیت دی کہ تنقید کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے اور ایک نقاد اپنے عہد کے شعور سے پوری طرح بہرہ ور نظر آنا چاہیے۔

اُردو تنقید میں "عصری شعور" کا آغاز اس وقت ہی ہو گیا تھا جب مولانا حالی نے تنقید لکھنی شروع کی تھی۔ مولانا حالی نے اس دور میں جب کہ ساری دکانوں پر ایک جیسا مال دستیاب تھا، اپنی ایک الگ دکان کھولی جس کا مال بھی دوسروں سے الگ تھا اور اس کا معیار بھی دوسروں سے مختلف تھا۔ مولانا حالی کے یہاں "عصری شعور" ایک محدود شکل میں نظر آتا ہے جسے ہم سماجی تناظر میں معاشرتی دائرے میں رکھ کر دیکھ سکتے ہیں۔ جب انھوں نے یہ کہا کہ شاعری سوسائٹی کے تابع ہے تو وہ دراصل "عصری شعور" ہی کی بات کر رہے تھے، لیکن یہ عصری شعور کی ابتدائی شکل تھی جس میں سماجی شعور کا رویہ غالب تھا۔ اُردو ادب میں حالی وہ پہلے نقاد ہیں جن کے تنقیدی نظریات منظم اور مربوط شکل میں ملتے ہیں۔ ان کا تنقیدی نظام جزئیات سے نہیں بلکہ ایک کُل سے تشکیل پاتا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کے لیے نئے معیارات قائم کیے۔ مبالغہ آرائی اور بے لگام تخیل سے گریز کرنے کی تلقین کی اور جدید اردو تنقید کے لیے نئے اصول، معیارات اور پیمانے وضع کیے۔

حالی نے اپنی اولین تنقیدی کتاب مقدمہ شعر و شاعری (۱۸۹۳ء) میں تمام تر شاعری سے سروکار رکھا ہے۔ انھوں نے غزل، قصیدہ اور مثنوی کے حوالے سے جو مباحث چھیڑے ہیں ان میں شعر کی ماہیت، منصب اور ضروری اوصاف، شاعری کا سماجی زندگی سے تعلق اور اس کی اہمیت، اردو شعری اصناف کا تجزیہ اور ان کی خوبیاں و خامیاں اور زبان اور لفظیات کی اہمیت وغیرہ شامل ہیں۔ حالی کی تنقید کے یہ بنیادی نکات ان کی تنقید کا بنیادی خاکہ قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ان نکات کی روشنی میں ہم واضح طور پر یہ سمجھ سکتے ہیں کہ حالی کے نزدیک اجتماعی زندگی کس قدر اہمیت کی حامل ہے اور شاعری کس طرح اس اجتماعی زندگی کو متاثر کرتی ہے اور پھر اس سے آگے بڑھ کر قومی تاریخ اور تہذیب پر کتنے گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ یہ نقطۂ نظر ہمیں سیدھا اس خیال تک پہنچاتا ہے کہ حالی کس حد تک اپنے عہد کی صورتِ حال سے باخبر تھے اور اپنے عہد میں ہونے والی نو بہ نو تبدیلیوں اور تغیرات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ اسی بات کو انھوں نے آگے چل کر وضاحت کے ساتھ مقدمے میں بیان کیا ہے۔ وہ نہ صرف سوسائٹی میں شاعری کی افادیت کا علم رکھتے تھے بلکہ شعر کی تاثیر سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ کسی عہد یا زمانے کا شاعری پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ شاعری نا شائستگی کے زمانے میں ترقی کرتی ہے۔ جبکہ شائستگی کے زمانے میں یہ قائم تو رہتی ہے لیکن اس کا تیزی سے آگے بڑھنے کا عمل متاثر ہوتا ہے۔ شاعری کے لیے جمہوری دور زیادہ مناسب ہوتا ہے جبکہ شخصی حکومت اور آمریت کے زمانے میں شاعر کی آزادی کو نقصان پہنچنے سے شاعری بھی متاثر ہوتی ہے۔ بُری شاعری نہ صرف سماج کو نقصان پہنچاتی ہے بلکہ شاعر کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔ مولانا کے خیال میں سب سے بڑا نقصان جو شاعری کے بگڑ جانے اور اس کے محدود ہو جانے سے ملک کو ہوتا ہے وہ اس کے لٹریچر اور زبان کی تباہی و بربادی

ہے۔(۲) لہٰذا کسی ملک کی شاعری کا اس کے لٹریچر کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ شاعری کے فنی پہلوؤں پر مباحث سے الگ مولانا حالی نے شاعری کے مفہوم کو ایک وسیع تر تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ملٹن کے الفاظ میں شعر کی یہ تعریف کی ہے:

''شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو۔'' (۳)

مولانا حالی کے خیال میں سادگی صرف لفظوں کی ہی نہیں بلکہ خیالات کی بھی ہے۔ خیالات ایسے نازک اور دقیق نہیں ہونے چاہئیں۔ جن کے سمجھنے کی عام ذہنوں میں گنجائش نہ ہو اور دوسرا یہ کہ شعر اصلیت پر مبنی ہو یعنی خیال کی بنیاد ایسی چیز پر ہونی چاہیے جو درحقیقت کچھ وجود رکھتی ہو اور جوش سے صرف یہی مراد نہیں کہ شاعر نے جوش کی حالت میں شعر کہا ہو یا شعر کے بیان سے اس کا جوش ظاہر ہوتا ہو بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ شعر پڑھنے والوں کے دلوں میں جوش پیدا کیا جائے۔ مولانا حالی نے شعر کی تاثیر کے حوالے سے جتنی بھی مثالیں دی ہیں وہ سب کی سب سماجی حوالہ رکھتی ہیں اور عصری شعور کے ذیل میں آتی ہیں۔ اسی طرح شاعری کے لیے مولانا حالی نے تین چیزیں تخیل، کائنات کا مطالعہ اور تفحص الفاظ کو ضروری قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں اگر شاعر ان تینوں چیزوں پر قدرت رکھتا ہے تو وہ اپنے شعر کے ذریعے اپنے ہم جنسوں کے دل میں اثر پیدا کر سکتا ہے۔ مولانا حالی اپنے دور کی شاعری کے لیے اصول وضوابط وضع کرنا چاہ رہے تھے کہ یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے ملک کے اندر قوی انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ الغرض حالی کی یہ اولین تنقیدی کاوش یہ بتانے کی کوشش ہے کہ بدلتے ہوئے زمانے میں شاعری کے مطالبات کیا ہیں اور بدلتی ہوئی شاعری سے زمانے کی کیا توقعات کیا ہیں۔ انھوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ شاعری کیا ہو کر ہمیں کیا فائدے پہنچا سکتی ہے اور کیا نہ ہونے کی صورت میں ہمیں اس سے کیا نقصان پہنچ سکتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ 'مقدمہ شعر و شاعری' سے قبل اردو میں تنقید بالکل ابتدائی شکل میں تھی اور زیادہ تر عملی تنقید کے نمونے ملتے تھے۔ مولانا حالی پہلے نقاد ہیں جنھوں نے سب سے پہلے بنیادی اصول ونظریات وضع کیے۔ وہ ذہنی طور پر سرسید تحریک سے وابستہ تھے۔ جس کا بنیادی مقصد معاشرتی اصلاح کرنا تھا چنانچہ حالی نے شاعری کا تعلق معاشرے سے قائم کیا۔ ان کے نزدیک شاعری کی تمام تر اہمیت سوسائٹی کے لیے ہے۔ لہٰذا سوسائٹی کی آواز اور اس کے مطالبات پر کان دھرنا بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر ضیا الحسن نے مولانا حالی کو باقاعدہ عمرانی نقاد کے طور پر متعارف کرایا ہے۔ ان کے خیال میں:

''ان کی تنقید عمرانی نظریات کی پیداوار نہیں ہے بلکہ اپنے عہد کی عمرانی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔'' (۴)

جب ہم عصر کی بات کرتے ہیں تو عصر کا تعلق سماج ہی سے ہوتا ہے زمانہ کسی معاشرے یا سماج ہی پر اطلاق پاتا ہے۔ لہٰذا تنقید کے بارے میں مولانا حالی کا سماجی رویہ دراصل ان کا عصری رویہ ہے۔ جس کا وہ اس حد تک ادراک رکھتے ہیں کہ انھوں نے ایسے زمانوں کی بھی نشاندہی کر دی جن میں شاعری پروان چڑھتی ہے اور سکہ رائج الوقت بن جاتی ہے۔ چنانچہ وہ ایک طرف شاعری پر سماج کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں تو دوسری طرف سوسائٹی پر

شاعری کے اثرات بھی ان کی تنقید کا اہم موضوع ہیں۔ شاعری کو سوسائٹی کے تابع قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قاعدہ ہے کہ جس قدر سوسائٹی کے خیالات، اُس کی رائیں، اُس کی عادتیں، اُس کی رغبتیں، اُس کا میلان اور مذاق بدلتا ہے، اسی قدر شعر کی حالت بدلتی رہتی ہے اور یہ تبدیلی بالکل بے ارادہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ سوسائٹی کی حالت کو دیکھ کر شاعر قصداً اپنا رنگ نہیں بدلتا بلکہ سوسائٹی کے ساتھ ساتھ وہ خود بخود بدلتا چلا جاتا ہے۔'' (۵)

بہر حال مولانا حالی کا ذہن ادب اور سماج کے باہمی تعلق کی تمام جزئیات سے بخوبی آگاہ تھا۔ انھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی سماجی زندگی پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ دونوں کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے اور شعر کی تاثیر سے انھیں پوری توقع تھی کہ وہ معاشرے میں انقلابی تبدیلیاں لانے کی بھر پور صلاحیت رکھتی ہے۔ مولانا کے نزدیک ادب ایک سماجی پیداوار ہے اور یہ اپنے معاشرے کا عکاس، مفسر اور ترجمان ہوتا ہے۔ معاشرتی حالات، سماج، زمانہ، تہذیب اور ادبی قدریں تغیر پذیر رہتی ہیں۔ لہٰذا ان تبدیلیوں کے ساتھ انسان کو بھی بدلنا چاہیے۔ مولانا حالی نے معاشرے کے زوال سے انسلاک کر کے سماجی شعور کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے معاشرے کی دھڑکنوں کو محسوس کیا اور اس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کی کیفیتوں کو جانچنے کی سعی کی اور اپنے دور میں تخلیق کیے جانے والے ادب کی نوعیت کو بھی سمجھنے کی کوشش کی۔ یہی سماجی شعور عصری حوالے سے عصری شعور کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ آج پھر اس عہد انتشار میں ادبی تنقید اس دوراہے پر کھڑی ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر پھر سے حالی کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آج اُردو تنقید بے وزنی کے عالم میں ہے۔ ہمارے پاس اس وقت کوئی اتنی بڑی ادبی تھیوری نہیں ہے جو تنقید کے ڈانواں ڈول نیا کے لیے لنگر کا کام کر سکے۔ اسی لیے آج پانی پت کے الطاف حسین حالی کی ڈیڑھ صدی بعد پہلے سے بھی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آج کا عہد اپنے حالی کی تلاش میں ہے۔'' (۶)

مولانا شبلی کی شخصیت بیک وقت عالم، مؤرخ، نقاد، سوانح نگار، معلم، مصلح، ادیب، شاعر اور انشاء پرداز کی ہے۔ اُن کا شمار بھی اپنے عہد کے اہم نقادوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی حالی کی طرح تنقید کو چند اصطلاحوں میں سے نکال کر با قاعدہ نظریہ سازی کی۔ شبلی کی شخصیت بھی حالی کی طرح وقت کے عصری اور سماجی حالات سے متاثر تھی۔ اس وقت کے ادب اور زندگی کے عام رجحانات کے اثرات ان پر بھی نمایاں ہیں اور ان کی جھلک ان کی تنقید میں بھی نظر آتی ہے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ شبلی کی تنقید جمالیاتی اصولوں سے ترتیب پاتی ہے۔ اس بات میں جزوی صداقت موجود ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان کے یہاں عمرانیاتی حوالے نظر انداز ہو گئے ہوں۔ سرسید کی اصلاحی تحریک سے وابستہ کسی ادیب کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ مقصدیت اور اصلاحی نقطہ نظر سے بالکل بیگانہ ہو جائے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ شبلی کی تنقید کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شبلی کی تنقید میں اجتماعی اور عمرانی نقطہ نظر بھی ہے مگر اس کے باوجود ان کا مزاج جمالیاتی اور

تاثراتی رویے کی طرف خاص جھکاؤ رکھتا ہے اور قدرے اُن بلاغتی تصورات سے بھی متاثر ہے جو ان کے ادبی اکتساب اور ادبی روایت نے انہیں دیے تھے، مغربی خیالات سے شبلی کا استفادہ ، حالی کے مقابلے میں، کچھ زیادہ واضح ہے۔ انھوں نے جن نظریات سے استفادہ کیا ہے ان کی صحیح شکل ان کے علم میں محفوظ معلوم ہوتی ہے ، بلکہ اس استفادے کی وجہ سے وہ اپنے شعر و ادب اور اپنے علوم کے مطالعے کے مثبت اصول بنانے میں بھی ایک حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں یہ امتزاج بہت حسین معلوم ہوتا ہے۔ مگر بعض جگہ اپنی روایت اور مغربی روایت گھل مل نہیں سکی۔'' (۷)

ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس رائے کی روشنی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کی تنقید میں عمرانی یا سماجی پہلو موجود تو ہے لیکن اس طرح واضح شکل میں نظر نہیں آتا ہے جیسے حالی کے یہاں موجود ہے۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

''حالی کی طرح انھوں (شبلی) نے شاعری کے سماجی پہلو پر کہیں مفصل بحث نہیں کی ہے۔ مضامین دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ سماجی حالات کی تبدیلی سے شاعری میں تبدیلی ہونے کو وہ بھی ضروری قرار دیتے ہیں اور شاعری اور سوسائٹی اور شاعری کی تبدیلی کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک شاعری میں قومی وملکی خصوصیات کا جھلکنا ضروری ہے۔ اس خیال پر انھوں نے یقیناً کہیں بحث نہیں کی ہے لیکن ان کی تحریروں میں اس طرف اشارے ضرور ملتے ہیں۔''(۸)

شبلی کی تنقید میں شعر العجم جلد چہارم کو وہی مقام حاصل ہے جو حالی کی تنقید میں مقدمہ شعر و شاعری کو۔ انھوں نے شعر العجم میں شعر کی ماہیت سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ لفظ ومعنی، تخیل، محاکات، اخلاق، اثر آفرینی، الفاظ اور ان کے استعمال ، سادگی، اصلیت، شعر کی تاثیر اور معاشرت کا شاعری پر اثر وغیرہ جیسے موضوعات پر بھی اپنے نقطہ نظر سے اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے تنقید کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کی طرف توجہ کی۔ ان کی تنقید کا خاص میدان شاعری ہے۔ شعر میں سادگی ادا کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں سادگی ادا سے مراد یہ ہے کہ جو مضمون شعر میں ادا کیا جائے وہ بے تکلف سمجھ میں آ جائے۔ ان کے نزدیک شاعری کا منبع ادراک نہیں بلکہ احساس ہے اور جب یہ احساس الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر کے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے خیال میں شبلی کے ہاں تمام عالم ایک شعر ہے۔ زندگی میں شاعری بکھری پڑی ہے جہاں زندگی ہے وہاں شاعری موجود ہے اور جہاں شاعری موجود ہے وہاں زندگی ہے۔ (۹) شبلی نے شعر میں اصلیت اور واقعیت کو ضروری قرار دیا ہے۔ کیونکہ زندگی کی اصلیت اور واقعیت سے بھرپور ترجمانی ہی شعر کا مقصد ہے۔ لکھتے ہیں:

''شاعری سے اگر تفریح مقصود ہو تو مبالغہ کام آ سکتا ہے لیکن وہ شاعری جو ایک طاقت ہے، جو قوموں کو زیر و زبر کر سکتی ہے، جو ملک میں ہلچل ڈال سکتی ہے، جس سے عرب قبائل میں آگ لگا دیتے تھے، جس سے نوحہ کے وقت در و دیوار سے آنسو نکل پڑتے تھے، وہ واقعیت و اصلیت

سے خالی ہو تو کچھ کام نہیں کر سکتی۔'' (۱۰)

مولانا حالی کی طرح شبلی بھی معاشرے پر شاعری کے اثرات کے قائل تھے۔ ان کے خیال میں شاعری ایک بہت بڑی قوت ہے جس سے بہت سے کام لیے جاسکتے ہیں۔ اس سے زندگی بسر کرنے کی خواہش اور لوگوں میں شریفانہ اخلاق بھی پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''شریفانہ اخلاق پیدا کرنے کا شاعری سے بہتر کوئی آلہ نہیں ہو سکتا۔ علم اخلاق ایک مستقل فن ہے اور فلسفہ کا جزو اعظم ہے۔ ہر زبان میں اس فن پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اخلاق تعلیم کے لیے ایک شعر ضخیم کتاب سے زیادہ کام دے سکتا ہے۔ شاعری ایک موثر چیز ہے اس لیے جو خیال اسکے ذریعے سے ادا کیا جاتا ہے دل میں اتر جاتا ہے اور جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے۔ اس بنا پر اگر شاعری کے ذریعے سے اخلاقی مضامین بیان کیے جائیں اور شریفانہ جذبات مثلاً شجاعت، ہمت، غیرت، حمیت، آزادی کو اشعار کے ذریعہ سے ابھارا جائے تو کوئی اور طریقہ برابری نہیں کرسکتا۔'' (۱۱)

شبلی نے خود بھی ایسی ہی شاعری کی اور دوسرے شعرا کو بھی اخلاقی شاعری پر اکسایا۔ شبلی شعر و ادب پر معاشرے کے اثرات کے بھی قائل تھے اس لیے انھوں نے شعر و ادب پر تمدن اور معاشرتی اثرات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ مباحث ان کے اپنے عہد کے مسائل اور صورتحال کی وجہ سے ان کی فکر کا حصہ بنے۔ شبلی کے سماجی شعور کے حوالے سے محمد اسحاق قریشی لکھتے ہیں:

''شبلی پہلے نقاد ہیں جنھوں نے ادب پر معاشرت، تمدن، نظام حکومت اور معاشی حالات کا اثر محسوس کیا اور دوسروں کو بھی محسوس کرانے کی کامیاب کوشش کی۔ آج کل کے نقاد جس شے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں یعنی ادب پر طبعی حالات کا اثر دکھانے کی کوشش، یہ کام شبلی اب سے نصف صدی پہلے کرچکے ہیں۔'' (۱۲)

شبلی کی دوسری تنقیدی کتاب موازنہ انیس و دبیر ہے جو ان کے گہرے تنقیدی شعور کی عکاس ہے۔ اس میں انھوں نے فصاحت و بلاغت اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اصولی و نظریاتی بحث کی ہے۔ جہاں تک شبلی کے عصری شعور کا تعلق ہے تو یہ بات بنیادی اہمیت کی حامل ہے کہ کوئی بھی نقاد عصری شعور سے بے بہرہ ہو کر تنقید کا حق ادا نہیں کرسکتا چنانچہ ان کے یہاں ہمیں کئی ایسی مثالیں نظر آجاتی ہیں جن سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ شبلی کی ایک حیثیت تاریخ دان کی بھی ہے چنانچہ ان کا تاریخی شعور اس امر کا متقاضی ہے کہ وہ ادب پر ہونے والے معاشرتی و عمرانی اثرات کو نظرانداز نہ کریں کیوں کہ اس کے بغیر ان کی نقادانہ حیثیت متاثر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شارب ردولوی کی یہ سطور خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ جن میں وہ لکھتے ہیں:

''یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی تنقید صرف تاثراتی ہی ہے کیونکہ وہ ایک گہرا تاریخی و معاشرتی شعور بھی رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو نظر آتے ہیں وہ ادب میں ایک طرف سیاسی رد و

بدل کے اثرات دیکھتے ہیں تو دوسری طرف ذوقی اور جمالیاتی پہلوؤں کا خیال رکھتے ہیں۔"(۱۳)
اس تناظر میں دیکھا جائے تو وہ زبان کے معاشرتی میلانات و رجحانات پر زور دیتے نظر آتے ہیں۔ واقعیت یا اصلیت کو شعر میں تاثیر پیدا کرنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور اس معاملے میں مولانا حالی سے اتفاق کرتے ہیں۔ اپنی تمام تر جمال پسندی کے باوجود وہ شاعری کو اعلیٰ اخلاقی کمالات پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور یوں سوسائٹی پر شاعری کے اثرات کے قائل ہیں اسی طرح طرزِ معاشرت کے شعر و ادب پر اثرات کے بھی قائل ہیں۔ انھوں نے اس بات کا بھی اقرار کیا ہے کہ مطلق العنان بادشاہوں کے زمانے میں زیادہ تر قصیدہ اور مثنوی کو فروغ حاصل ہوا اور یوں شاعروں کو وہ آزادی نصیب نہیں ہوئی جو اعلیٰ شعری تخلیق کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اسی طرح شبلی نے معاشرت کے اختلاف کے شاعری پر اثرات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ اسی طرح ایک ہی زبان کی شاعری مختلف ملکوں میں مختلف خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ تمدن و معاشرت کے فرق کی وجہ سے شاعری میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ شبلی تخلیق ادب میں نسل پرستی کے بھی قائل ہیں۔ اس کا براہ راست تعلق عصری شعور سے یوں بنتا ہے کہ ان کے خیال میں کمینہ خاندان سے تعلق رکھنے والا اگر کوئی شخص شعر کہے گا تو اس کی شاعری سے کمینگی جھلکے گی۔
صلے کی تمنا نے شاعری میں ایسی خرابیاں پیدا کیں کہ ہر کس و ناکس نے شاعری میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ شبلی شعر و ادب پر آب و ہوا کے اثرات کا بھی تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ طرزِ معاشرت اور شاعر کی اعلیٰ نسبی کے ساتھ ہر ملک کی آب و ہوا کے اثرات بھی اس ملک کی زبان اور شاعری دونوں پر پڑتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں کی زبان پر پہاڑوں کی سختی کے اثرات اور صحراؤں کے رہنے والوں کی زبان میں صحرائی اثرات ضرور ہوں گے۔ شبلی کی تنقیدی فکر سے اختلافات رکھنے کے باوجود تمام نقادوں نے ان کی تنقیدی بصیرت اور اردو تنقید میں ان کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے اپنے ایک مخصوص زاویہ نگاہ سے اپنا انداز تنقید وضع کیا اور سرسید کے اصلاحی پروگرام سے وابستہ رہتے ہوئے بھی اور اس سے الگ ہو کر بھی اپنے تنقیدی معیار کو ہمیشہ قائم رکھا۔
حالی اور شبلی کے یہ نقطہ ہائے نظر بڑی وضاحت سے ہمیں عصری شعور کے قریب تر لے آتے ہیں۔ جہاں تخلیق کار اور نقاد دونوں ایک ہی سوچ کے حامل نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ عصری شعور کے دائرے میں محض ایک عہد، ایک زمانہ یا ایک صورتحال ہی نہیں آتی بلکہ ان کے تمام تر متعلقات بھی عصری شعور میں شامل ہیں۔ مثلاً اگر ایک زمانہ عصر میں شامل ہے تو اس میں کوئی علاقہ یا خطہ بھی ضرور ہونا چاہیے جس پر وہ زمانہ گزر رہا ہے۔ اس خطے کی آب و ہوا اور موسموں کا ذکر بھی ہونا چاہیے۔ وہاں کے لوگ، ان کی بود و باش، تہذیب و تمدن، معاشرت، سماجی حالات یہ سب اجزا زمانے یا عصر کے کل میں شامل ہیں، لہٰذا ایک نقاد جب کسی تخلیق کا جائزہ لیتے ہوئے عصری شعور کو بروئے کار لاتا ہے تو اس میں وہ تمام سماجی، عمرانی، معاشرتی، معاشی، تہذیبی، تمدنی، تاریخی، تعلیمی اور سیاسی حالات بھی شامل ہو جاتے ہیں جو اس زمانے یا عصر سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔ اس تناظر میں شبلی کی شعر العجم ہو یا موازنہ انیس و دبیر یا مولانا حالی کی مقدمہ شعر و شاعری ہو یہ سب کی سب اسی عصری شعور کی ذیل میں آجاتی ہیں جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں بیان کی گئی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اُردو تنقید کا ارتقاء، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۱ء، ص ۱۵۰

۲۔ حالی، الطاف حسین، خواجہ، مقدمہ شعر و شاعری، لاہور، پاپولر پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳ء، ص ۵۸

۳۔ ایضاً، ص ۵۳

۴۔ ضیاء الحسن، ڈاکٹر، اُردو تنقید کا عمرانی دبستان، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۴۷

۵۔ حالی، الطاف حسین، خواجہ، مقدمہ شعر و شاعری، ص ۴۹

۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، مجموعہ ڈاکٹر سلیم اختر، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۲۴۱

۷۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید، دوسرا ایڈیشن، لاہور، مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۷۲ء، ص ۱۷۵

۸۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اردو تنقید کا ارتقاء، ص ۱۷۵،۱۷۶

۹۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، تنقید اور اصول تنقید، لاہور، ادارہ ادب وتنقید، ۱۹۸۴ء، ص ۱۴۹

۱۰۔ مولانا شبلی نعمانی، شعر العجم جلد چہارم، لاہور، عشرت پبلشنگ ہاؤس، س۔ن، ص ۵۹۔۶۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۷۳

۱۲۔ محمد اسحاق شمسی، شبلی کا تنقیدی شعور، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۰ء، ص ۲۶۴، ۲۶۵

۱۳۔ شارب ردولوی، ڈاکٹر، جدید اردو تنقید اصول و نظریات، لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۹۴ء، ص ۲۹۵

حالی اور شبلی کے فکری اشتراکات

منور ہاشمی

ABSTRACT:

Maulana Altaf Hussain Hali and Allama Shibli Noumani are both contemporary personalities and as a matter of fact both were much confluenced by Ali Garh and Sir Syed Ahmad Khan. Both of them won carrels in the fields of biography writing , history writing and verse writing art criticism with reference to all these genres. Their writings, style and methodology may be different but they carry glaring similarity and commonality. They both made same type of stylistic literary experiments. They both tried their pens in the best possible way to safeguard the nation and defend Islam, patriotism and the cases of pitiable conditions of the Muslims. Both of the guided them nation through their creative and God-gifted qualities.

مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا محمد شبلی نعمانی اپنے افکار و نظریات اور تصانیف کے اعتبار سے دو عہد ساز شخصتیں ہیں۔ انہوں نے اپنی اپنی جگہ مخصوص علمی و ادبی میدانوں میں انقلاب برپا کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دونوں نے اپنی الگ الگ حیثیت میں کام کیا جو مقاصد ان کے ذہنوں میں تھے، ان کے حصول کے لیے جو بھی راستے تھے ان پر کبھی الگ الگ اور کبھی ایک ساتھ سفر کیا۔ یہ وہ دور تھا جب ملتِ اسلامیہ انتہائی مایوسی اور بے چارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد انہیں ہر طرف تاریکی دکھائی دے رہی تھی۔ ایک محکوم اور مجبور قوم کو اپنا مستقبل بہت مایوس کن دکھائی دے رہا تھا۔ اس عالم میں سر سید احمد خان نے اُمید کی ایک کرن بن کر سامنے آئے اور مسلمانوں میں فروغ تعلیم کا مشن شروع کیا۔ اس مشن کا ایک حصہ بننے کے لیے الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی ہندوستان کی دو مختلف تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہوئے علی گڑھ پہنچے۔ دونوں کے دلوں میں علم کی محبت موجزن تھی۔ وہ علم حاصل کر کے اس سے قوم کو فائدہ پہنچانے کا عزم رکھتے تھے۔

مولانا حالی دہلوی مزاج اور تہذیب و ثقافت جبکہ مولانا شبلی لکھنوی طرزِ زندگی کا ایک نمونہ تھے۔ دونوں کی

عمروں میں فرق ضرور تھا مگر ذہنی طور پر برابر محسوس ہوتے تھے۔ کیونکہ ایک مشن پر ایک ہی جذبے کے تحت کام کا آغاز کیا تھا۔ حصول علم اور خدمت ملت کے اسی جذبے نے انہیں علی گڑھ کا راستہ دکھایا تھا۔ علی گڑھ کے جوہری سرسید احمد خاں نے انہیں اپنے حلقہ رفاقت میں فوری طور پر داخل کیا اور ان سے بہت بڑے بڑے کام لینے کی منصوبہ بندی کر لی۔ یہ ایک بحرانی دور تھا۔ اس بحران نے پوری امتِ مسلمہ کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ ہر طرف مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ ہندو اور انگریز جو مسلمان قوم کو زبوں حالی میں دھکیلنے کی سازش میں برابر کے شریک تھے یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب اس قوم کا ابھرنا ناممکن ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ بحرانوں کی کوکھ سے ہی شخصیات ابھرتی ہیں جو انقلابات کا باعث بنتی ہیں۔ سرسید نے ایسے ہی نابغے اپنے گرد جمع کر لیے تھے۔

سرسید کے اپنے مقاصد اس سارے تانے بانے میں کچھ بھی ہوں لیکن نتائج کے اعتبار سے یہی تانا بانا اُمّہ کے سنبھلنے اور بعدازاں کی منزل پر گامزن ہو کر منزل پا لینے کا باعث بنا۔ اس منزل کے راستے میں آگے چل کر قوم کو علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح ملے مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس دشوار گزار راستے کی ابتدائی دشواریاں کن لوگوں کے ہاتھوں آسانیوں میں تبدیل ہو سکیں۔ شروع شروع کے کانٹے کس کے ہاتھوں سے صاف ہوئے۔ سب لوگ بے شک کہیں کہ کوئی اور عمارت بنائی جا رہی تھی جو مسجد میں تبدیل ہو گئی۔ ہمیں تو نتیجہ دیکھنا ہے نتیجہ اگر مسجد کی تعمیر ہے تو عمارت کی پہلی اینٹ رکھنے والے بھی قابل قدر ٹھہرے۔ اس کارِ خیر میں شریک ویسے تو تمام شخصیات کی مساعی قابل تعریف ہے مگر حالی اور شبلی کی کارگزاری پر جتنا لکھا جائے کم ہے۔ یہ دونوں علمی و ادبی میدان میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ دونوں فطرتاً جامع الصفات تھے۔

فکری لحاظ سے دونوں میں بے شمار اقدار مشترک دکھائی دیتی ہیں۔ دونوں نے علمی و ادبی میدان میں ایک جیسی اصناف کو ذریعہ اظہار بنایا۔ حالی سوانح نگار تو شبلی بھی سوانح نگار۔ حالی نے تنقید لکھی تو شبلی نے بھی تنقید کو شعار بنایا۔ حالی شاعر تھے، شبلی بھی شاعر۔ حالی نے ابتدا میں تحقیقی نثر لکھی، شبلی نے بھی تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ حالی اور شبلی دونوں نے اپنے دور کے مستشرقین کی طرف سے لکھی گئی کتابوں اور رسالوں میں اسلام اور ہادیٔ اسلام کے حوالے سے ہرزہ سرائی کے خلاف مضامین اور رسائل تحریر کیے جس سے ان کے افکار میں ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ حالی نے اس حوالے سے تریاق مسموم، پادری عماد الدین کی تاریخ محمدیؐ پر منصفانہ رائے'' اور شواہد الالہام'' نامی کتابچے تحریر کیے۔ ان کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالقیوم کی رائے ملاحظہ کریں:

> ''مولانا حالی نے زمانے کے رواج کے مطابق مناظرے کا رنگ اختیار کیا ہے مگر ان کی تحریر میں جوش و خروش اور غم و غصہ کا اظہار نہیں بلکہ استدلالی رنگ غالب رہا اور معقولیت اور تہذیب کا رنگ کہیں پھیکا نہیں پڑنے پایا''۔(۱)

ولانا شبلی نعمانی نے یورپی مورخین، محققین اور نقادوں کی کتابیں اور مضامین کا باضابطہ طور پر مطالعہ کیا اور ان کے مدلل اور موثر جوابات پر مبنی مضامین تحریر کیے۔ جو مقالاتِ شبلی کے عنوان سے سامنے آچکے ہیں۔ ان مضامین کی اہمیت اور شبلی کے اندازِ تحریر کے حوالے سے سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں:

''ایسے ہوشمند حریفوں کے مقابلے کے لیے ساری دنیائے اسلام میں جو شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے جنہوں نے انہی کے طریقے سے ان ہی کے اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض و برکت کی فرح بخش ہواؤں نے دنیا کے علم و تمدن کی بہاروں کو کیسے دبہالا کیا''۔(۲)

حالی اور شبلی دونوں کے دل اُمتِ مسلمہ کی زبوں حالی پر تڑپتے تھے۔ وہ تاریخ اسلام کا مطالعہ کر کے ماضی کے آئینے میں مسلمانوں کا حال اور مستقبل دیکھ رہے تھے۔ حالی نے اپنے دل کی تڑپ اور اپنی روح کے اضطراب کو مسدس مدوجزرِ اسلام میں سمو دیا۔ ایک ایسی طویل نظم وجود میں آئی جو آج تک ادبی شہکار کی حیثیت بھی رکھتی ہے اور مشعلِ راہ بھی ہے۔ نمونے کے چند شعر دیکھیے:

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا
جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
زمانے سے پیوند جس کا جدا تھا
نہ کشور ستاں تھا نہ کشور کشا تھا
تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایا
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا (۳)

قبیلے قبیلے کا بت اک جدا تھا
کسی کا سبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عزہ پہ وہ نائلہ پر فدا تھا
اس طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا
نہاں ابر ظلمت میں تھا مہر انور
اندھیرا تھا فاران کی چوٹیوں پر (۴)

اس طویل نظم میں اسلام سے پہلے عربوں کی حالت سے لے کر حالی کے اپنے دور تک کے حالات بیان کیے گئے۔ اسلام کی آمد، عروج اور پھر مسلمانوں کے زوال کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ زوال کے اسباب تلاش کیے گئے اور ان اسباب کے تدارک کے لیے تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تشریف آوری کا ذکر:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا

وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوا
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ (۵)

مسدس حالی کے حوالے سے رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''مولانا کی سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے۔ یہ ایک نیا دور پیدا کرنے والی کتاب ہے۔ اس کی مقبولیت اب بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ یہ ایک الہامی کتاب ہے اور اس کی تاریخ ارتقائے ادب اردو میں ایک سنگ نشان سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک نیا تارہ ہے جو اردو کے اُفق شاعری پر طلوع ہوا۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی''۔(۶)

اس نظم کی ہر طرف دھوم مچ گئی۔ اس کے دل میں اتر جانے والے انداز کے باعث سب متاثر ہو رہے تھے۔ مولانا شبلی بھی اسی دور میں اس قسم کے جذبات کے ساتھ نظم 'صبح اُمید' کے ساتھ مسدس کے تاثر کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہوگئے۔ مسدس حالی کی طرح کی مثنوی 'صبح اُمید' میں بھی مسلمانوں کے ماضی اور حال پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مستقبل کے لیے فکرمندی کا اظہار ہے۔ سید سلیمان ندوی اس مثنوی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس وقت تک مثنوی صرف قصے کہانیوں تک محدود تھی۔ ابھی تک اسے قومی مقاصد کے لیے کام میں نہیں لایا گیا تھا۔ مولانا شبلی نے اس میں پہل کی''۔(۷)

مثنوی اپنے اسلوب اور تاثر کے لحاظ سے باکمال ہے۔ مثنوی کے اشعار دیکھیے:

''جس چشمے سے اک جہاں تھا سیراب
وہ سوکھ کے ہو رہا تھا بے آب
پیچھے ہٹنے لگی تھی یہ بڑھ کر
دریا یہ اتر چلا تھا چڑھ کر
مٹنے پہ تھا جو نشاں ہمارا
خواب اور ہوا گراں ہمارا (۸)

اس کے علاوہ اسی درد میں ڈوبی ہوئی نظم 'تماشائے عبرت' (قومی مسدس) اور 'شہر آشوب' اسلام بھی تحریر کی۔ حالی اور شبلی کی نظمیں ہیئت کے اعتبار سے بھی مماثلت رکھتی ہیں اور فکری لحاظ سے بھی۔ قومی مسائل، مسلمانوں کی تعلیم و تربیت میں بھی اور ثقافتی مظاہروں اور تہذیب و تمدن کے حوالے سے دونوں شخصیات کے افکار میں یکسانیت اور مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کے دل ایک جیسے جذبات رکھتے تھے اور ایک رفتار اور انداز سے دھڑکتے تھے۔

شبلی اور حالی جب تنقید کے میدان میں اترے تو اس میں چمن کھل اٹھے۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر

تنقید کے بنیادی اصول مرتب کر دیے جبکہ شبلی نے شعر العجم کی تصنیف سے تنقید اور اصنافِ سخن کی تعریف کا حق ادا کر دیا۔ دونوں تنقیدی نظریات کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے ملاحظہ کریں:

''صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالی عملی تنقید اچھی کرتے ہیں۔ چونکہ وہ ذوق شعری سے بدرجہ کمال متصف ہیں اس لیے اچھے شعر کی شناخت میں بے نظیر ہیں۔ اس پر ان کا یہ خاص وصف ہے کہ وہ عموماً شعر کی وضاحت اور تشریح خوب کرتے ہیں، ۔ ۔ ۔ مگر ایسے نقادوں کی اصول بندی عموماً کمزور رہی۔ حالی بھی اصول بندی میں کمزور ہیں''۔(۹)

شبلی کے حوالے سے بھی ان کی رائے کچھ زیادہ مختلف نہیں:

''احساس یہ کہتا ہے کہ وہ اصول بند نقاد سے زیادہ عملی نقاد ہیں اور اس حیثیت میں ان کا ذوق ان کے اصولوں سے الگ الگ چلتا نظر آتا ہے اور بعض دفعہ اپنے ہی اصولوں کے برعکس ۔ ۔ ۔ وہ کافی پھیلاؤ ہونے کے ساتھ شعر و سخن کی لطافتوں کا تجزیہ بھی کرتے ہیں اور قاری کے لیے اپنی تنقیدی بحث کو دلچسپ بھی بنائے جاتے ہیں۔ شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر کی تشریحات، ذوق کے لیے یوں ہیں گویا دبستان کھل گیا''۔(۱۰)

شعر کی تعریف اور تنقید کے حوالے سے دونوں کے نظریات و افکار میں بہت حد تک یکسانیت ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو دونوں شخصیات تاریخ نویسی، شاعری، مقاصد شاعری، سوانح نگاری اور تنقید کے حوالے سے ملتے جلتے افکار رکھتے ہیں اور ان تمام اصناف سے متعلق ان کے جو مقاصد تحریر ہیں وہ مماثل و مشترک ہیں۔

حواشی/حوالے:

۱۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، حالی کی اردو نثر نگاری، لاہور مجلس ترقی ادب ۱۹۶۴ء، ص ۶۸۔
۲۔ ندوی، سید سلیمان، حیات شبلی، اعظم گڑھ، دار المصنفین ۱۹۴۳ء، ص ۲۵۔
۳۔ حالی، الطاف حسین، مسدس حالی، لاہور، خزینہ علم و ادب ۱۹۹۸ء، ص ۱۵۔
۴۔ ایضاً، ص ۱۶۔
۵۔ ایضاً، ص ۲۱
۶۔ سکسینہ، رام بابو، تاریخ ادب اردو، لاہور، سنگ میل ۲۰۰۴ء، ۲۰۳۔
۷۔ ندوی، سید سلیمان، حیات شبلی، اعظم گڑھ دار المصنفین ۱۹۴۳ء، ص ۱۴۸۔
۸۔ شبلی نعمانی، علامہ، کلیات شبلی نعمانی، لاہور الوقار پبلی کیشنز ۲۰۰۴ء، ص ۱۵-۱۶۔
۹۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، اشارات تنقید، لاہور، سنگ میل ۲۰۰۸ء، ص ۱۵۹۔
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۶۹۔

شبلی کی شاعری - ایک مطالعہ

ڈاکٹر یاسمین سرور

ABSTRACT:

This article depicts various aspects of Shibli's poetry. Shibli's whole poetry is the description of the political incidents of his period and his religious thoughts. Actually when Shibli saw heartrendeing events around him, he molded them into the poetry. His religious poetry reminds the dignity of the Muslims in past and encourages them to follow their fore-fathers.

علامہ شبلی نعمانی اردو کے عناصر خمسہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ عموی طور پر ان کی وجہ شہرت بطور سیرت نگار، تاریخ نگار، سوانح نگار اور نقاد کی ہے۔ المامون، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم، سیرت النبی، شعرالعجم، الکلام اور علم الکلام ان کی اہم تصانیف ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر بھی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ علامہ شبلی کو بطور شاعر بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

شاعری کا ملکہ ان میں فطری طور پر موجود تھا۔ انھوں نے کسی سے شاعری کی اصلاح نہیں لی۔ محض اپنی فطری شاعرانہ بصیرت کے بل بوتے پر شاعری کی۔ سید سلیمان ندوی اس امر کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''مولانا شبلی نعمانی کی اردو شاعری بالکل خودرو پودا ہے۔ نہ انھوں نے اس میں کسی سے اصلاح لی، نہ جم کر اردو شاعری کی اور نہ ہی کبھی اردو شاعری کو عزت و شہرت کا ذریعہ سمجھا۔''(۱)

جس طرح ایک خودرو پودا کسی بیرونی مدد کے بغیر نشوونما پاتا ہے اسی طرح شبلی نے بھی شاعری کے اسرار و رموز خود اپنے ہی باطن سے اخذ کیے اور ان کو ہی پیمانہ بنا کر بغیر کسی استاد کے شاعری کی۔ ابتدا میں شبلی نے روایتی طرز کی شاعری کی لیکن جلد ہی وہ دبستان سرسید سے تعلق رکھنے اور علی گڑھ تحریک سے وابستگی کی بنا پر اپنے عہد کی فضا کے موافق مقصدیت کے تحت شاعری کرنے لگے۔ انھوں نے دینی سماجی، اصلاحی، تاریخی اور سیاسی معاملات و واقعات کو موضوع سخن بنایا۔

شبلی کی شاعری کو عام طور پر دو ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک دور قیام علی گڑھ کے دوران شاعری کا ہے تو دوسرا دور علی گڑھ سے علیحدگی کے بعد کا دور ہے۔ اول الذکر دور مقصدیت پر مبنی شاعری کا دور ہے اور موخر الذکر دور قومی، ملی، مذہبی اور سیاسی شاعری کا دور ہے۔ تاہم سید سلیمان ندوی نے کلیات شبلی کے خلاصے میں ان کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ابتداء سے ۱۸۸۳ء تک ہے اس میں ایک طویل نظم، ایک قصیدہ اور چند نظمیں شامل ہیں۔ دوسرا دور ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۸ء تک ہے اس میں ایک مثنوی "صبح امید"، دو قصیدے اور کچھ غزلیں ملتی ہیں۔ شبلی کی شاعری کا تیسرا دور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء تک ہے اس میں چند غزلیں ہی ملی ہیں اور چوتھا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ ہے جس میں ہمیں شبلی کی بہترین نظمیں ملتی ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی نے شعر العجم میں شعر و شاعری کی واضح تعریفیں متعین کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ انھوں نے شعر کی روایتی تعریف یعنی کلام موزوں کے بارے میں اپنی اختلافی رائے کو مفصل بیان کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شاعری محض وزن اور قافیہ کا نام نہیں۔ چنانچہ شعر کی اصل حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

"شعر (جیسا کہ ارسطو کا مذہب ہے) ایک قسم کی مصوری یا نقالی ہے فرق یہ ہے کہ مصور صرف مادی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتا ہے بخلاف اس کے شاعر ہر قسم کے خیالات، جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔" (۲)

درج بالا بیان میں علامہ شبلی شعر کو ایسی مصوری یا نقالی قرار دیتے ہیں جس کے ذریعے ہر قسم کے جذبات و احساسات و معاملات اور واقعات کی تصویر کشی کی جاسکتی ہے۔ شاعری تو وہ ہے جو ان سنی اور ان دیکھی چیزوں اور معاملات کو اس قرینے سے بیان کرے کہ وہ منظر قاری کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور وہ خود کو اسی فضا میں جیتا جاگتا محسوس کرے۔ شبلی اس کی مزید توضیح یوں کرتے ہیں:

"اسی بناء پر کسی چیز کا بیان جب اس طرح کیا جائے کی اس شے کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے تو اس پر شعر کی تعریف صادق آئے گی۔ دریا کی روانی، جنگل کا سناٹا، باغ کی شادابی، سبزہ کی لہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی شدت، گرمی کی تپش، جاڑوں کی ٹھنڈک، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی یا رنج، غضب، جوش، محبت، افسوس، حسرت، خوشی، ان اشیاء کا اس طرح بیان کرنا کہ ان کی صورت آنکھوں میں پھر جائے یا دہی اثر دل پر طاری ہو جائے۔ پس یہی شاعری ہے۔" (۳)

وہ شعر کی تعریف کرتے ہوئے مزید بیان کرتے ہیں:

"وہ جذبات جو الفاظ کے ذریعے ادا ہوں وہ شعر ہیں ۔۔۔۔۔ شعر کی تعریف یوں بھی کر سکتے ہیں کہ جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک دے وہ شعر ہے۔" (۴)

یوں علامہ کے نزدیک شعر جذبات کو تحریک دینے والا اور برانگیختہ کرنے والا کلام ہے۔ وہ اسے جذبات کا

بیان بھی کہتے ہیں۔ کسی بھی قسم کے حالات و واقعات ہوں جب وہ جذبات کو اپیل کرتے ہیں تو شاعر ان سے متاثر ہو کر ان کے بارے میں اپنی تخلیق پیش کرتا ہے۔ چنانچہ وہ شاعری کی منطقی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''جو کلام اس قسم کا ہو گا کہ اس سے جذبات انسانی برانگیختہ ہوں اور اس کے مخاطب حاضرین نہ ہوں بلکہ انسان خود اپنا آپ مخاطب ہو، اس کا نام شاعری ہے۔(۵)

شاعری کے علاوہ بھی کئی ایسی چیزیں ہیں جو جذبات کو برانگیختہ کرتی ہیں۔ چنانچہ شبلی برانگیختگی سے ایسی تحریک مراد لیتے ہیں جو عام انسانوں پر اثر انداز نہیں ہوتی ہیں اور صرف ایک حساس طبیعت کے مالک شاعر کے جذبات کو ہی اپیل کرتی ہے۔ شبلی اس حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''شاعر کے جذبات اور احساسات فطرۃً نہایت نازک لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہیں ۔دوست کی جدائی ہر شخص کے دل پر اثر کرتی ہے لیکن شاعر اس موقع پر بالکل بے تاب ہو جاتا ہے۔ دریا کی روانی سے ہر شخص کو خطرہ ہوتا ہے لیکن شاعر پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ سبزہ کے دیکھنے سے ہر شخص کو فرحت ہوتی ہے لیکن شاعر جھومنے لگتا ہے۔(۶)

ان تمام تعریفوں کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ شبلی شاعری کے ضابطوں سے واقف تھے۔ شعر کیا ہے، شاعری کسے کہتے ہیں، ایک شاعر کیسا ہوتا ہے، وہ ان تمام فنی نزاکتوں کا شعور رکھتے تھے۔ شاید اس لیے ان کی شاعری میں بھی کمال فن کی یہ جھلک نمایاں ہے۔

شبلی نعمانی نے شروع شروع میں روایتی شاعری کا انداز اپنایا لیکن سرسید تحریک کے زیر اثر ان کے قلب و ذہن میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی اور انھوں نے قدیم اور فرسودہ شاعری کو زوال آمادہ شاعری قرار دے دیا۔ وہ اس حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

بے ہودہ فسانہائے یاریں
زلف و خط و خال کے مضامین
وہ نوک مژہ کی نیزہ بازی
وہ شرک نگہ کی فتنہ سازی
کی سیر بھی گرچہ بحروبر کی
لیکن نہ خبر ملی کمر کی
نالوں کے جب دکھائے تماشے
گردوں کے اڑا دیے پرخچے

(کلیات شبلی، ص ۱۹)

چنانچہ شبلی جلد ہی اپنے ہم عصر شعراء و ادبا کی طرح قومی و ملی اور معاشرتی زندگی کے مسائل اور حقیقتوں کو ادب کے پیمانے میں ڈھالنے لگے۔ انھوں نے اصلاحی، سماجی اور مقصدی شاعری کو اپنا شعار بنایا۔ ''صبح امید''، ''کفران نعمت''، ''عدل جہانگیری''، ''ہمارا طرز حکومت''، ''احرار قوم''، ''طفل سیاست''، ''ہنگامہ مسجد

کانپور''، ''علمائے زندانی''، ''شہر آشوب اسلام''، ''شرائط صلح''، ''آپ ظالم نہیں زنہار پر ہم ہیں مظلوم''، ''خون کے چند قطرے''، ''تقسیم عمل'' اور ''پابہ زنجیر کانپور'' جیسی نظمیں ان کے قومی، ملی اور سیاسی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ان کی نظم ''صبح امید'' مثنوی کی ہیئت میں مولانا الطاف حسین حالی کی مسدس مدو جذر اسلام کا رنگ لیے ہوئے ہے۔شبلی نے یہ نظم حالی سے ہی متاثر ہو کر لکھی۔اسے قومی مسدس ''تماشائے عبرت'' بھی کہا جاتا ہے۔یہ نظم علامہ شبلی نعمانی نے سرسید کے قومی تعمیری علی گڑھ میں چندہ جمع کرنے کے لیے نہایت پرسوز لہجے میں سنائی۔یہ نظم شبلی کے قومی جذبات کی حقیقی آئینہ دار ہے۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام
جب قوم تھی فرق مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی
جو تاج تھی فرق آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال
کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال
یہ قوم کہ تاج آسماں تھی
اب کوئی گھڑی کی مہماں تھی
عزت رہی نہ جاہ و ثروت
افلاس کی بج چکی تھی نوبت

(کلیات شبلی،ص ۱۶-۱۳)

یہ نظم موضوع کے اعتبار سے قومی مرثیہ ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کے سینے میں ایک سچے مسلمان کے دل کا حقیقی کرب اس نظم میں کھل کر سامنے آگیا ہے۔زور بیان کے حوالے سے یہ فنکاری کا اچھا نمونہ ہے۔فنی پختگی، بلند خیالی، روانی ان کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے جو اس نظم میں بھی بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔اس نظم کے پہلے حصے میں شبلی نے مسلمانوں کے ماضی کی جھلک دکھا کر انہیں عظمت رفتہ کے کھونے کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔دوسرے حصے میں انھوں نے اس ڈوبتی ہوئی ملت کے سامنے سرسید کے کردار کی مرقع سازی کی ہے اور آخری حصے میں انہیں تحریک کے لیے کھل کر امداد دینے کی ترغیب دیتے ہوئے یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ تحریک ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے مسلمان ان زوال پذیر حالات سے باہر نکل کر زمانے کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے دوبارہ اپنا اصل مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

یوں ۳۵۳ اشعار پر مبنی یہ نظم حالی کی مسدس کے زیر اثر ہے۔حالی نے بھی مسدس مدو جذر اسلام میں مسلمانوں کے تابناک ماضی کو بیان کرتے ہوئے انہیں اپنی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ کا احساس دلانے کو کوشش کی ہے۔البتہ دونوں نظموں کے اسلوب بیان میں واضح فرق موجود ہے۔کچھ ناقدین ''صبح امید'' کو زبان واسلوب کے

حوالے سے مسدس حالی پر فوقیت دیتے ہیں۔ لیکن مسدس حالی میں ادبی چاشنی اور روانی شبلی کی اس نظم سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ نظم جذبات و احساسات کی بہترین عکاسی تو ضرور ہے مگر زبان و بیان میں شبلی کی فلاسفیانہ، عالمانہ اور ناقدانہ شخصیت اس نظم کے مجموعی حسن پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ اسی حوالے سے ڈاکٹر حامدی کاشمیری اپنی رائے یوں پیش کرتے ہیں۔

''لیکن دونوں نظموں میں وہی فرق ہے جو دونوں کی شخصیتوں میں ہے۔ مسدس میں مسلمانوں کی پستی کے بارے میں حالی کا دردِ دل ایک نوحے میں ڈھل گیا ہے لیکن مثنوی میں شبلی کا دردِ قومی ایک پر جوش اور ولولہ انگیز نغمے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس کے علاوہ حالی کے مقابلے میں شبلی کے انداز میں شگفتگی زیادہ ہے۔''(۷)

''صبح امید'' کے چند اشعار کی جھلک بعد میں علامہ اقبال کی نظموں ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' میں بھی نظر آتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے شبلی سے بھی اثر لیا ہے۔ اسلامی تہذیب اور مسلم قوم کے تابناک ماضی کے نقوش شبلی کے سامنے تھے وہ ایک مورخ کی حیثیت سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ شبلی کی اس نظم کے ذیل کے اشعار ملاحظہ کریں۔

کون تھا جس نے کیا فارس و یوناں تا راج
کس کی آمد میں فدا کر دیا جے پال نے راج
کس کو کسریٰ نے دیا تخت و زر و افسر و تاج
کس کے دربار میں تاتار سے آتا تھا خراج
تجھ پہ اے قوم اثر کرتا ہے افسوں جن کا
یہ وہی لوگ تھے کہ رگوں میں تیری خوں جن کا

(کلیات شبلی، ص ۱۷-۱۷)

علامہ اقبال نے بھی اسی انداز میں جواب شکوہ میں اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے ہر آشوب کو اپنی نظموں میں بڑی خوبصورتی سے سمویا ہے۔ ان کے عہد کا ہر اہم واقعہ ان کی نظموں میں ملتا ہے۔ ''شہر آشوب اسلام''، ''ہنگامہ مسجد کان پور''، ''تفرقہ حق و باطل میں'' اس کی مثالیں ہیں۔ شبلی ایک دردمند مسلمان کی حیثیت سے یوں نالہ کناں ہیں:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

(کلیات شبلی، ص ۱۵۲)

اسی نظم میں شبلی پوری ملت اسلامیہ پر ٹوٹنے والے مظالم کی منظر کشی کرتے ہوئے احساس زوال کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے مراکش وفارس، شام نجد اور فتح ایوبی کا ذکر کرتے ہیں۔ پورے عالم اسلام کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور شبلی اس زبوں حالی کی تصویر کشی کر کے مسلمانوں میں انسانی ہمدردی اور ملی حمیت اجاگر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کیفیت میں ان کے جذبات کچھ یوں ہیں:

بکھرتے جاتے ہیں شیرازہ اوراق اسلامی
چلیں گی تند باد کفر کی یہ آندھیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو اب شبلی کہاں جائیں
کہ اب امن و اماں شام و نجد و قیرواں کب تک

(کلیات شبلی، ص ۱۵۵)

مذکورہ بالا نظموں کے مطالعہ سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کا احساس اور فکر وتخیل پورے عالم اسلام کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ان کے اندر پوری ملت اسلامیہ کا درد موجود ہے۔ وہ اپنے سیاسی، سماجی، تاریخی اور تہذیبی شعور کو شاعری کی صورت میں بڑے فنکارانہ انداز میں نظم کرتے ہیں۔ ان کی شاعری فن کی تمام نزاکتوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ان کی نظمیں شیریں اور رچے ہوئے شعری ذوق کی آئینہ دار ہیں۔ وہ ہر واقعہ کو اپنے شعری تجربہ میں بڑی خوبصورتی سے سموتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ان کا سیاسی شعور نہایت بلند ہے اسی لیے وہ فصیح الفاظ میں ماضی کی جھلکیاں دکھا کر مسلمانوں میں احساس زوال پیدا کرنا چاہتے ہیں تا کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے وقار کی بحالی کے لیے سرگرداں ہوں۔ یہاں ہمیں ان میں ایک رہنما کی جھلک نظر آتی ہے شاید اسی لیے سجاد ظہیر بھی ان کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"شبلی کی عظمت کا راز کیا ہے؟ وہ اسلامیان ہند کی تہذیبی زندگی کے اس موڑ کے رہنما ہیں جہاں سرسید کا بتایا ہوا راستہ تاریخی اعتبار سے ختم ہوتا ہے اور وہ شاہراہ آزادی شروع ہوتی ہے جس پر ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، مختار احمد انصاری اور خود علامہ اقبال جیسی مقتدر ہستیاں گامزن نظر آتی ہیں۔" (۸)

شبلی کی شاعری کا ایک اور رخ ان کی مذہبی شاعری بھی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی تہذیبی میراث کی بقا کے لیے مذہب کے مثالی کرداروں کی زندگیوں سے سبق آموز نکات کو نظم کی صورت میں پیش کرنا از حد ضروری ہے تا کہ امت مسلمہ کی نوجوان نسل کے اذہان کی آبیاری کی جاسکے۔ چنانچہ انھوں نے "ہجرت نبوی"، "تعمیر مسجد نبوی"، "ایک خاتون کی آزادانہ گستاخی اور رسول اللہ کا حلم اور عفو"، "اہل بیت کی زندگی"، "ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر"، "مساوات اسلام"، "خلافت فاروقی کا ایک واقعہ"، "اظہار و قبول حق"، "جرات صداقت" اور "عدل فاروقی کا ایک نمونہ" جیسی شاہکار نظمیں تخلیق کیں۔ یہ نظمیں ان کی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں انھوں نے اپنی نظموں میں جزئیات نگاری، واقعہ نگاری کے اچھوتے اور منفرد مناظر پیش کیے ہیں جیسا کہ ان اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے:

تین دن رات رہے ثور کے غاروں میں پنہاں
تھا جہاں عقرب واقعی کی حکومت کا اثر
نیم جاں خوف عدو، ترک غذا، بختی راہ
ان مصائب میں ہوئی اب شب ہجرت سے سحر

(کلیات شبلی، ص۹۴)

ہم دیکھتے ہیں کہ شبلی نہایت خوبی سے منفرد اور خوبصورت تراکیب کو استعمال کرتے ہوئے غار ثور کے واقعہ کو بیان کر رہے ہیں۔ مشکل زمینوں اور لمبی بحروں کا بخوبی استعمال ان کے کمال شاعری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اسی طرح اہل بیت رسول کی زندگی کی مثالیں پیش کر کے مسلمان قوم کے سامنے اسلامی تاریخ کے سنہرے دور کی منظر کشی کی ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

افلاس سے تھا سیدہ پاک کا یہ حال
گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں
چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار
گر نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا

(کلیات شبلی، ص۱۷)

مندرجہ بالا اشعار حضرت فاطمہ کی زندگی کی مشکلات کو پیش کرتے ہیں جب وہ بارگاہ رسالت میں اپنے لیے مال غنیمت میں سے کوئی غلام یا لونڈی مانگنے گئیں تو آپ نے ان کی دل جوئی کرتے ہوئے ان کو یہ باور کرایا کہ اصحابہ صفہ کی خدمت میں ان غلاموں کی زیادہ ضرورت ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ شبلی نعمانی کا رجحان سوانح نگاری، تاریخی حقائق، سیرت نگاری، اور دیگر علمی و ادبی کتب اور مضامین لکھنے میں رہا۔ اسی لیے انھوں نے شاعری کی طرف اتنی توجہ نہ دی یا یہ کہ انھوں نے شاعری کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا وسیلہ نہ بنایا۔ ورنہ شبلی کا مزاج رومانوی تھا۔ وہ شعرو شاعری کی خداداد صلاحیت اپنے سینے میں چھپائے بیٹھے تھے۔ اور وقتاً فوقتاً شاعری کے میدان کو اپنے خیالات کی جولانی سے گوہر بار کرتے رہتے تھے۔ ان کا شاعرانہ کلام بہت کم مگر معیاری ہے۔ ان کے اشعار اور نظمیں ان کی بہترین شعری بصیرت اور قابلیت کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ جس چیز کو بھی شاعری کے لبادے میں پیش کرتے ہیں مختصر مگر جامع اور فصیح الفاظ میں اس کی تمام جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ زیر نظر مختصری نظم میں دیکھیں انھوں نے کس خوبی کے ساتھ ایک واقعہ کی تمام جزئیات کو سمویا ہے:

کل مجھ کو چند لاشہ بے جان نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور تھے
کچھ طفل شیر خوار ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آگئی ہے منتظر نفخ صور ہیں
کچھ نوجوان ہیں بے خبر نشہ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناس ذوق دل ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادہ فنا
جو خاک میں ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم ،آئی یہ صدا
ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں

(کلیات شبلی ،ص۵۹)

ہم دیکھتے ہیں کہ شبلی نے نہایت فنکارانہ ہنر مندی سے معرکہ کانپور کو اس کی تمام جزئیات کے ساتھ مختصرا سمیٹا ہے۔ان کے اشعار میں مشکل تراکیب استعمال ہوئی ہیں لیکن وہ نامانوس نہیں ہیں بلکہ سوز وگداز ،اثر آفرینی اور ادبی چاشنی کا مرقع ہیں۔ان کا شعری اسلوب تلمیحات سے بھرپور علیمت کی شان بھی لیے ہوئے ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی سے بھی لبریز ہے۔الفاظ و تراکیب اچھوتے اور انوکھے ہیں جو اپنی ذات میں فصاحت و بلاغت کا عنصر لیے ہوئے ہیں۔ماضی کے حوالے،مورخانہ بصیرت اور دردوسوز سے بھرپور جذبات ان کی تحریر کا لب لباب ہیں۔ان کے اسلوب میں کمال بے ساختگی نظر آتی ہے۔وہ کسی بھی موضوع پر بے ساختہ اپنا مافی الضمیر بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

ان کی شاعری میں فطرت کی بھی حسین جھلکیاں نمایاں نظر آتی ہیں۔''تمہید قصیدہ مدح سلطان عبدالحمید خان'' میں وہ آغاز میں فطرت کے جو مناظر پیش کرتے ہیں وہ داد کے قابل ہیں۔ذیل کے اشعار اس کی واضح مثال ہیں:

پھر بہار آئی شاداب ہیں پھر دشت و چمن
چمن گیا رشک گلستان ارم پھر گلشن

شعلہ زن پھر چمنستان میں ہوئی آتش گل
پھر صبا چلتی ہے گلشن میں بچا کر دامن
آگ پانی میں لگادی ہے کسی نے شاید
حوض میں عکس گل و لالہ ہے یا جلوہ فگن
کوندتی برق ہے گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی
بوندیاں پڑتی ہیں چلتی ہیں ہوائیں سن سن

(کلیات شبلی، ص۹۱)

مذکورہ بالا اشعار فطرت کے مناظر کی دلکش عکاسی ہیں۔ آخری شعر میں صوتی آہنگ داد کے قابل ہے۔ شبلی کی شاعری کا یہ پہلو بھی ناقابلِ فراموش ہے کہ وہ طبقہ احرار سے تعلق رکھتے تھے اسی لیے وہ اپنی نظمیں اعلانیہ اپنے نام سے شائع کراتے تھے۔ ان کی نظمیں ندوۃ سے علیٰحدگی کے بعد زیادہ موثر اور جوشیلی ہو گئیں۔ ان میں طنز و مزاح کا ہلکا سا عنصر بھی نمایاں نظر آتا ہے "ان کی نظم علمائے زندانی" سے چند اشعار ملاحظہ کریں:

مساجد کی حفاظت کے لیے پولیس کی حاجت ہے
خدا نے آپ کو مشکور فرمایا، عنایت ہے
عجب کیا ہے کہ اب ہر شاہراہ سے یہ صدا آئے
مجھے بھی کم سے کم اک غسل خانے کی حاجت ہے
پہنائی جارہی ہیں عالمان دین کو زنجیریں
یہ زیور سید "سجاد" عالی کی وراثت ہے

(کلیات شبلی، ص۱۳۱)

شبلی کی شاعری کا ایک موضوع عشق بھی ہے شبلی نعمانی کی عشقیہ شاعری عطیہ فیضی کے گرد ہی گھومتی ہے۔ اس قسم کی شاعری زیادہ تر فارسی اشعار کی صورت میں ہے۔ شبلی نے فارسی شاعری میں "دستہ گل" اور "بوئے گل" کے نام سے جو غزلیات لکھی ہیں وہ وہ زبان و بیان کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہیں اور شبلی کی محبت کے خلوص کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان غزلوں کے متعلق شیخ محمد اکرام کہتے ہیں کہ

"شبلی کی فارسی شاعری الفاظ کے انتخاب، خیالات کی تازگی، طرز ادا کی شگفتگی میں ترشے ہوئے ہیرے ہیں۔(۹)

شبلی عطیہ سے بے حد محبت کرتے تھے یہ محبت دستی میں بدل گئی ان کی بے لوث محبت کا اظہار ان کے اس فارسی شعر سے بھی ہوتا ہے:

رگ سنگم ، رارے ے نویسم

کف خاکم، غبارے ے نویسم

ترجمہ: ''قرۃ عینی! تمہارا خط جو مدت کے بعد ملا تو بے ساختہ میں نے آنکھوں سے لگایا اور دیر تک بار بار پڑھتا رہا۔''(۱۰)

اردو میں جو اشعار ہیں وہ بھی عطیہ کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کی خوبصورت داستان معلوم ہوتے ہیں۔ ذیل کے اشعار شبلی کی ان کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں:

ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے
یہاں فکر ے جام و سبو ہو گی تو کیوں ہو گی
کہاں یہ لطف یہ منظر یہ سبزہ یہ بہارستان
عطیہ ! تم کو یاد لکھنو ہو گی تو کیوں ہو گی (۱۱)

غرض یہ کہ علامہ شبلی کی شاعری پہ اسلامی اقدار اور ان کے عہد کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ وہ ایک باکمال شاعر ہیں، انھوں نے اگرچہ ایک مختصر سا کلیات ہی اردو ادب کی جھولی میں ڈالا، لیکن جو بھی اشعار ہیں وہ سراپا انتخاب معلوم ہوتے ہیں۔ وہ شاعری کو تخیل اور محاکات کے زیر اثر وجدانی اور جمالیاتی شعور سمجھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جابجا تخیل کے سہارے عہد رفتہ کی یادیں تصویروں کی صورت منقش ہیں۔

حوالہ جات:

(۱) سلیمان ندوی، سید، تاریخ ادب اردو، جلد چہارم، ص ۳-۴
(۲) شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد اول، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۷۲ء، ص ۱۱
(۳) شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد اول، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۷۲ء، ص ۱۳
(۴) شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد اول، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۷۲ء، ص ۳
(۵) شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد اول، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۷۲ء، ص ۱۱
(۶) شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد اول، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۷۲ء، ص ۱۳
(۷) حامد کاشمیری، جدید اردو نظم اور یورپی اثرات، ۱۹۶۸ء، ص ۱۸
(۸) سجاد ظہیر (مضمون) مشمولہ شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، از عبداللطیف اعظمی شبلی اکادمی دہلی، ۱۹۴۵ء ص ۲۵
(۹) شیخ محمد اکرام، یادگار شبلی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۳۳۰
(۱۰) خطوط شبلی ص ۳۹
(۱۱) شبلی نعمانی، کلیات شبلی (اردو)، طبع چہارم، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء، ص ۲۲۳

شبلی بطور مورخ

ڈاکٹر قدیر انجم

ABSTRACT:

Maulana Shibli Naumani holds a prestigious position among Urdu historians. In fact being the pioneer of Urdu history he occupies the most significant position among his contemporaries who tried their hands at history. He hasn't written about any specific time or era, rather has been writing essays on different subjects according to the need. Maulana wrote many biographies as well which hold prominence in Islamic history. It is customary for Maulana Shibli to connect his subject with history even if it is academic or literary in nature.

مولانا شبلی نعمانی کو اردو تاریخ نویسی کی روایت میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ وہ اردو کے مورخِ اوّل اور اوّلیت کے اس شرف کے ساتھ ساتھ، وہ اپنے ان سب معاصرین میں جنھوں نے تاریخ نویسی کے میدان میں قدم رکھا ہے نمایاں امتیاز اور انفرادیت کے مالک ہیں۔ وہ اُردو کے صرف مورخِ اوّل ہی نہیں بل کہ تاریخ نگاری کی ایک منزلِ بلند اور اس کا عین مقصود و معیار بھی ہیں۔ شبلی نے کسی عہد یا زمانے کی کوئی باقاعدہ تاریخ نہیں لکھی البتہ ضرورت کے تحت وہ مختلف مواقع پر تاریخی موضوعات پر قلم اُٹھاتے رہے ہیں۔ انھوں نے تاریخی مضامین کے علاوہ کئی سوانح عمریاں بھی یادگار چھوڑی ہیں۔ اِن سوانح عمریوں نے مورخ کی حیثیت سے ان کے مقام کو مزید بلند اور ممتاز بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تصنیف ''تاریخ ادب اردو'' میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی ''تاریخ'' کو قدیم انداز سے نکال کر جدید یورپی معیار پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاریخ کے حوالے سے ان کا جدید زاویہ نظر یہ ہے کہ آج دنیا میں جو تمدن، معاشرت، خیالات، مذہب موجود ہیں سب گذشتہ واقعات کے نتائج ہیں جو خواہ مخواہ ان سے پیدا ہونے چاہئیں تھے۔ اس لیے ان گذشتہ واقعات کا پتا لگانا اور ان کو اس طرح ترتیب دینا جس سے

ظاہر ہو کہ یہ موجود واقعہ گذشتہ واقعات سے کیوں کر پیدا ہوا، اسی کا نام تاریخ ہے۔" ۱؎

فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کے فنون کسی حال میں بھی ایک دوسرے سے لگا نہیں کھاتے لیکن شبلی کے یہاں سوانح نگاری اور تاریخ نویسی میں فاصلے زیادہ نہیں۔ وہ بنیادی طور پر مورخ ہیں اس لیے ان کا ہر فعل مورخ کی حیثیت سے اور ہر کام مورخ کے روپ میں ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا رہا کہ وہ تاریخ کے بغیر لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ مولانا شبلی کی یہ عادت ہے کہ وہ خواہ ادبی وعلمی موضوع پر لکھ رہے ہوں اپنی بات کا رشتہ تاریخ سے ضرور ملا دیتے۔ اس بات کے شاہد "شعرالعجم" میں دیے جانے والے شاعروں کے طویل حالات زندگی اور "موازنہ انیس و دبیر" کے بعض حصے بھی ہیں۔ جہاں تاریخی واقعات کے بیان کی ضرورت نہ ہونے کے باوجود مولانا شبلی نے صفحات کے صفحات اپنے شوق کی تکمیل کے لیے وقف کر دیے ہیں۔ انھوں نے ایک جگہ اس بات کو خود بھی تسلیم کیا ہے کہ تاریخ ان کا اوڑھنا بچھونا ہے جس کے سہارے کے بغیر وہ ایک قدم بھی چل نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ صاحب سوانح کے حالات سے زیادہ تاریخ کو اہمیت دیتے ہیں۔ سوانح نگاری کرتے ہوئے بھی ان کے ذہن میں ہمیشہ تاریخ کا خیال رہتا ہے۔ ڈاکٹر اے ڈی ارشد اپنے مضمون "شبلی کا تحقیقی شعور" میں لکھتے ہیں:

> "یہ حقیقت ہے کہ شبلی گہرا تحقیقی شعور رکھتے تھے۔ جسے ان کے مخصوص انفرادی اور اجتماعی حالات نے تقویت دی تھی۔ شبلی کا زمانہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں نشاۃ ثانیہ کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کو سرسید جیسا راہ بر ملا، جس کے کارناموں نے شبلی کے تحقیقی شعور کو جلا دی۔ مغربی تہذیب کے زیر اثر جو فضا ملک اور دنیا میں پیدا ہو رہی تھی، وہ بھی شبلی کے یہاں تحقیقی نام کے لیے وجہ تحریک ثابت ہوئی۔ علاوہ ازیں شبلی نے بہت سے اعلیٰ علوم و فنون بڑے انہماک سے حاصل کیے تھے۔ انھوں نے شبلی کے تحقیقی کام میں زبردست اعانت کی۔" ۲؎

سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کے فنون کا سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ سوانح نگار کا کھینچا ہوا مرقع مصور کی بنائی ہوئی تصویر کی مانند ہوتا ہے۔ جو تصویر بناتے وقت صرف ان چیزوں کا انتخاب کر لیتا ہے جو اس کی نظر میں پسندیدہ ہوتی ہیں۔ دوسری طرف ایک غیر جانب دار مورخ کا قلم ایسی تصویر بناتا ہے جو کیمرے کی کھینچی ہوئی تصویر کی طرح ہوتی ہے۔ جس میں ہر اچھی بری چیز اس طرح سامنے آ جاتی ہے جیسی وہ حقیقت میں ہے۔ مولانا شبلی کی سوانح عمریاں دوسری قسم کی ہیں۔ اس لیے انھیں سوانح عمریوں کے بجائے تاریخی تصانیف قرار دینا زیادہ مناسب ہے۔ شبلی سوانح لکھتے وقت ایک وکیل کی طرح جانب داری سے اپنے موکل کا مقدمہ پیش نہیں کرتے بل کہ ایک غیر جانب دار مصنف کی طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ کر دیتے ہیں۔ وہ حقائق کو پیش نظر رکھنا اپنے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ بات بھی ان کے سوانح نگار سے زیادہ مورخ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اس کے علاوہ سوانح نگار زمانے سے زیادہ انسان کو اہمیت دیتا ہے اور مورخ انسان سے زیادہ زمانے سے دل چسپی رکھتا

ہے۔ پروفیسر محمد فرمان ''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند'' میں شامل اپنے مضمون ''شبلی نعمانی'' میں لکھتے ہیں:

> ''سوانح نگاری میں بھی شبلی کا انداز ایک مورخ کا سا ہے۔ وہ سوانح عمریوں کو پھیلا کر تاریخ بنا دیتے ہیں اور وہ سوانح اپنے عہد کی ایک جامع تاریخ بن جاتی ہے۔ واقعات کی صداقت اور سچائی پر زور دیتے ہیں۔ اگر چہ وہ اپنے ہیرو کے بشری خط و خال دکھانے ضروری قرار دیتے ہیں مگر وہ ایسے بزرگ اشخاص کی سیرت لکھتے ہیں جن کی بشری کمزوریوں کا تذکرہ نہ کرنا بھی قابلِ ملامت نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود وہ اپنی مولفہ سوانحی کتابوں میں فطرتِ انسانی کی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔'' ۳۸

سوانح عمری ''المامون'' ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ زمانہ شبلی کے علی گڑھ میں قیام کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تصنیف کے پیچھے کہیں کہیں سرسیّد کے خیالات نظر آتے ہیں۔ مولانا شبلی اس بات کے قائل ہیں کہ مورخ کو ہمیشہ غیر جانب داری سے کام لینا چاہیے۔ چناں چہ مامون سے عقیدت کے باوجود انھوں نے مامون کے بے موقع گن نہیں گائے بل کہ حقیقت کو غیر جانب داری سے رقم کیا ہے۔ فنی لحاظ سے ''المامون'' کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ شبلی نے ایک بڑے انشا پرداز اور مزاجاً شاعر ہونے کے باوجود کہیں بھی بلاضرورت اپنی رنگین بیانی کے جوہر دکھانے کی کوشش نہیں کی۔ ۱۸۹۱ء میں شبلی نے ناموران اسلام میں سے حضرت نعمان بن ثابتؒ کی سوانح ''النعمان'' کے نام سے لکھی۔ دو حصوں میں منقسم اس تصنیف کا دوسرا حصہ جس کی ضخامت کتاب کے تقریباً تین چوتھائی حصے پر مشتمل ہے۔ اسے مولانا شبلی نے امام ابوحنیفہؒ کی تصانیف پر تبصرے کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ اس کے باوجود ''النعمان'' کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا شبلی نے تاریخ نویسی کی ایک صحیح نبض شناس کی طرح کہیں بھی سچائی کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ''الفاروق'' ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی۔ مولانا شبلی نے حضرت عمرؓ کے سیاسی نظامِ حکومت کو منظر عام پر لانے کی طرف زیادہ توجہ دی ہے اور اپنے مورخانہ، عالمانہ اور محققانہ طرزِ تحریر اور استدلال سے یہ ثابت کر دیا کہ اہلِ یورپ جس سیاسی نظامِ حکومت پر آج ناز کرتے ہیں، اس کا حیرت انگیز سبق آج سے تیرہ سو برس قبل حضرت عمرؓ پڑھا چکے ہیں۔

اچھی تاریخ نویسی کے لیے تحقیق و تدقیق نہایت ضروری ہے تاکہ مورخ ہر واقعہ کو سند کے ساتھ پیش کر سکے کیوں کہ تاریخ ذاتی رائے کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی۔ ''الغزالی'' مولانا شبلی کی تصانیف میں تاریخ اور سوانحی لحاظ سے سب سے کم زور کتاب ہے۔ اس میں مولانا شبلی نے امام غزالی کے ذہنی ارتقا کا تو بڑی خوب صورتی سے احاطہ کیا ہے لیکن ان کی شخصی زندگی اور اپنے اصول کے خلاف ان کے زمانے کی معاشرتی و تہذیبی تاریخ نظرانداز کر گئے ہیں۔ مولانا شبلی کی تصانیف میں حرفِ آخر ''سیرت النبیؐ'' ہے۔ وہ اسے اپنے لیے وسیلۂ نجات سمجھتے ہیں۔ اہلِ علم کا کہنا ہے کہ آج تک ''سیرت النبیؐ'' سے زیادہ محققانہ، عمدہ اور جامع المعلومات کتاب رسول کریمؐ پر نہیں لکھی گئی۔ مولانا شبلی ''سیرت النبیؐ'' کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہیں کہ اردو میں سیرت النبیؐ پر کوئی مستند کتاب نہ تھی اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو سیرت النبیؐ پر کچھ جاننے کے لیے انگریزی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا جو تعصب،

رنگ آمیزی اور ناواقفیت کی وجہ سے غلطیوں کا جنگل بنی ہوئی تھی۔ چناں چہ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے سیرت لکھنے کی طرف توجہ مبذول کی۔ مواد کی فراہمی اور جانچ پڑتال کے لیے انھوں نے "الندوہ" میں "مجلس تالیف سیرت نبویؐ" قائم کی۔ بعدازاں انھوں نے سیرت نبویؐ کا ایک دفتر قائم کیا جس میں ایک عربی اور دو انگریزی کے مترجم رکھے۔ خود مولانا شبلی انگریزی نہیں جانتے تھے اس لیے مترجموں کے ذمے رسول کریمؐ پر لکھی جانے والی تصانیف کا ترجمہ کرنا قرار پایا کیوں کہ مولانا شبلی یورپی مصنفین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا جواب دینا نہایت ضروری سمجھتے تھے۔ انھوں نے سیرت کی تصنیف میں جس محنت اور جستجو سے کام لیا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہفتے میں دو یا تین صفحے سیرت کے لکھتے تھے باقی وقت لکھنے کے لیے سوچ بچار اور تحقیق و تدقیق میں گزرتا تھا۔ اختر وقار عظیم "شبلی بحیثیت مورخ" میں لکھتے ہیں:

"شبلی کی پُر مقصد تاریخ نویسی کا ایک مقصد یہ تھا کہ ناموران اسلام کی عظمت کی داستانیں سنا کر مسلمانوں کی ڈھارس بندھائیں۔ ظاہر ہے یہ مقصد جس عمدگی سے رسول کریمؐ کی سیرت پر لکھنے سے پورا ہو سکتا تھا اور کسی طرح پورا نہ ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو پوری زندگی ہی عظمت کی داستانوں کا مجموعہ ہے۔ پھر یہ کیسے ہوتا کہ ان کی داستان حیات لکھی جاتی اور کتاب کا کوئی صفحہ ان کی عظمت کے بیان سے خالی رہتا۔ جگہ جگہ شبلی نے ان کی عظمت کی داستانیں بکھیری ہیں جو اسلام اور پیغمبر اسلام کی منھ بولتی تصویریں ہیں۔" ؏

مولانا شبلی نے جہاں تنقید اور سوانح عمریوں میں تاریخ نگاری کا رنگ بھر دیا وہاں ان کی شاعری بھی تاریخی واقعات سے روشن ہے۔ وہ ہر چیز کو مورخ کی باریک بین نظر سے دیکھتے ہیں اور شاعر کے حساس دل سے محسوس کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ہر وقت مورخ شبلی پیش پیش نظر آتا ہے۔ چناں چہ انھوں نے ایسی نظمیں لکھیں جو ایسے واقعات کو پیش کرتی ہیں جن سے مسلمانوں کے دل میں ان کے آباؤ اجداد کی یاد تازہ ہو جائے۔ مولانا شبلی کے نزدیک دیرپا اور فوری اثرانگیزی کی صلاحیت نثر سے زیادہ نظم میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے نظم کو اظہار کا ذریعہ بنایا اور زیادہ تر ایسے تاریخی واقعات کو نظم کیا جن میں مسلمانوں کی عظمت کی جھلک نمایاں ہو۔ مثال کے طور پر حضرت زبیرؓ کی شہادت کا واقعہ شبلی نے اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ سچائی بھی اپنی جگہ قائم ہے اور شاعرانہ تاثیر بھی اپنا کام کر رہی ہے:

مسند آرائے خلافت جو ہوئے ابن زُبیر
سب نے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھائے یک بار
حرمِ کعبہ میں محصور ہوئے ابن زُبیر
فوج بے دیں نے کیا کعبۂ ملت کا حصار
صلح کر لوں کہ چلا جاؤں حرم سے باہر
یا یہیں رہ کے اسی خاک پہ ہو جاؤں نثار

تاریخ نویسی کا ایک اہم اصول ہے کہ ہر بات سیدھے سادے انداز میں بغیر کسی لگی لپٹی کے بیان کر دی جائے۔ شاعر کو اس کی شاعرانہ تعلّی مورخ کے منصب سے دور لے جاتی ہے لیکن مولانا شبلی کے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ وہ ایک واقعے کو نثر میں جس طرح بیان کرتے ہیں اُسے پوری دیانت داری سے نظم بھی کر دیتے ہیں۔ وہ نہ بھول بھلیوں میں گم ہوتے ہیں اور نہ کہیں شاعرانہ تخیلات میں۔ اس کی بہترین مثال کان پور کا ۱۹۱۲ء کا واقعہ ہے جب محلہ مچھلی بازار میں مسجد کے ایک حصہ کو منہدم کر دیا گیا اور مسلمانوں کے جلسہ میں حکام نے نہایت بے رحمی سے نہتے مسلمانوں پر گولیاں چلائیں۔ اختر وقار عظیم اپنی تصنیف "شبلی بحیثیت مورخ" میں لکھتے ہیں:

> "شاعر شبلی کے حساس دل مورخ شبلی کی باریک بین نظر کے امتزاج نے شبلی کی نظموں کو شعریت اور واقعیت کا حسین مرقع بنا دیا ہے۔ شبلی نے جن نظموں میں تاریخی واقعات کو شعر کا موضوع بنایا ہے ان میں تاریخ کے اصولوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور شعر کے نازک آبگینے کو بھی ٹھیس نہیں پہنچنے دی۔ تاریخ کی اصلیت اپنی جگہ قائم ہے اور شعر کی شعریت اپنی جگہ۔ اردو میں نثری تاریخ نویسی کی طرح شعری تاریخ کی بنیاد رکھنے کا سہرا بھی شبلی کے سر ہے۔" ۵

مختصر یہ کہ مولانا شبلی نے تاریخ نویسی ایک مقصد کے پیش نظر شروع کی اور وہ مقصد تھا مسلمانوں کے اباؤاجداد کی عظمت کی داستانیں سنا کر ان کے دل کو گرمایا جائے۔ یہ ایک لحاظ سے مذہبی مقصد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم اس کو اس طرح کہیں کہ شبلی کی تاریخ نویسی میں ہر جگہ ان کا دین چھایا ہوا ہے تو غلط نہ ہوگا لیکن مذہب سے گہری وابستگی کے باوجود مولانا نے تاریخ نویسی کے بنیادی اصولوں کو مذہب کی خاطر قربان نہیں کیا۔ وہ ان نامور شخصیات کی اچھائیوں کے ساتھ ساتھ اُن کی بشری کم زوریوں کو بھی بیان کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان شخصیات کی اچھائیاں ان کی بشری کم زوریوں پر بھاری ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو، جلد چہارم۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۲ء، ص ۱۰۸۲

۲۔ کریسنٹ شبلی نمبر۔ لاہور: اسلامیہ کالج، جنوری ۱۹۷۱ء، ص ۳۲۵

۳۔ پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (مدیر عمومی)۔ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند، جلد چہارم۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۳

۴۔ اختر وقار عظیم۔ شبلی بحیثیت مورخ۔ لاہور: ابلاغ پبلشرز، ۱۹۶۸ء، ص ۴۰

۵۔ ایضاً۔ ص ۱۰۲

حالی وشبلی کی شاعری رجائیت کے آئینے میں

ڈاکٹر شگفتہ فردوس

ABSTRACT:

Moulana Altaf Hussain Hali and Shibli Naumani are legends of Urdu literature . They earned a lot of respect in different aspects of creative work like criticism, biography and poetry. In this research article, their poetry is analyzed in optimistic perspective.

Moulana Altaf Hussain Hali is one of the pioneers of new style in Urdu poetry and prose. He introduced many reforms in Urdu literature through his optimistic poems like Mussadas-e-Hali known as" Maddo Jazr-e-Islam "Nishat-e-Ummed" or "Tohfatul Akhwan".

Shibli Naumani also belongs to the modern school of Urdu Poetry. He devoted major part of his life to literary pursuits. One of his outstanding achievements was his well-known poem "Subh-e-Umeed" pervading optimism and concluding with the forecast of bright future for Islam. His poems like "Gadayane Qoum", "Qaseeda-e-Urdu" are some other examples of his optimistic poetry.

تیرے سرودِ رفتہ کے نغمے علومِ نو
تہذیب تیرے قافلہ ہائے کہن کی گرد (۱)

مفکر اسلام اقبال نے قومی شاعری کو مہمیز کرنے والے عہد آفریں شعرا حالی وشبلی کو خراجِ تحسین پیش کیا تو ان کی نگاہ ان اکابر شعرا کے نغمات نو پر مرتکز تھی۔ وہ ان کے پس پردہ ''قافلہ ہائے کہن'' کی کاوشوں سے بھی بخوبی آشنا تھے۔

حالی وشبلی اپنے منفرد اسلوبِ شعری سے حمیت قوم کو اجاگر کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ جدت و اصلاح کے پیکر میں ڈھل کر ان شعرا کا سفر قوم کی فلاح اور کامرانی کی امید سے ہمیشہ وابستہ رہا۔ امید جو زندگی کا اثاثہ ہے، جس سے حیاتِ نو کے سرچشمے پھوٹتے ہیں، اسی کے رجائی رنگ و آہنگ سے حالی وشبلی کی شاعری میں بھی درخشندگی کے جگنو دمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ رجائیت کی وضاحت کرتے ہوئے آل احمد سرور رقم طراز ہیں:

''رجائیت زندگی پر ایمان، کسی مسلک کی وفاداری، تاریکیوں میں روشنی، بادلوں میں چاندی کی لکیر دیکھنے کا نام ہے۔'' (۲)

حالی وشبلی کی شاعری بھی اپنے مسلک کے ہمراہ تاریکیوں میں روشنی کی مظہر دکھائی دیتی ہے جس سے رجائیت کو فروغ ملتا ہے۔ اسی سے انسان کے فکر و عمل میں وہ انقلاب برپا ہوتا ہے جو حالات کو منقلب کرنے کے لیے آبِ حیات کا کام کرتا ہے۔ اس مثبت طرزِ فکر سے ان اکابر شعرا نے برصغیر کے مسلمانوں کو جینے کا حوصلہ عطا کیا۔ رجائیت کے اسی مثبت رنگ کو بیان کرتے ہوئے اختر پرویز فرماتے ہیں:

''رجائیت کو ہم زندگی کا ایک مثبت رویہ کہہ سکتے ہیں، جو انسان کو نامساعد حالات میں جینا سکھاتا ہے۔'' (۳)

رجائیت مربوط فکر و عملی نظام اور آفاقی اصطلاح کا نام ہے۔ حالی وشبلی کی شاعری میں رجائیت کا عنصر ان کی ذاتی اثر پذیری (Self-efficacy) اور توجیہی رجائی انداز (Optimistic Explanatory Style) کے پیشِ نظر کارفرما رہا۔ ان شعرا نے اپنے مثبت طرزِ فکر سے حالات و واقعات کے پس پردہ مستقبل کے روشن پہلو پر اپنی توجہ مرکوز کی اور قوم کو عالی ہمتی اور جہدِ مسلسل کی روش اپنا کر جادۂ حیات میں نتائج پر اثر انداز ہو کر سرخرو ہونے کا راز بتایا۔ جیسا کہ خود حالی نے فرمایا:

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالیؔ
یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز (۴)

تاریخ ادب اردو میں حالی کی متنوع شخصیت کو ان کی غزل گوئی، جدید نظم کے بانی، جدید اردو تنقید کے نقطۂ آغاز اور سوانح نگاری میں منفرد اسلوب کے حامل ہونے کے حوالے سے ممتاز مقام حاصل ہے۔ انھوں نے ہر صنفِ ادب میں قدما کے تتبع پر جدت کو فوقیت دی۔ حالی نے اپنے رباعیات و قطعات، مرثیے، ترکیب بند اور قصائد میں حقیقت حال کو موضوعِ سخن بنا کر غلو کے راستوں کو مسدود کیا۔ ابتداءً مرزا داغ اور غالب کے تلمذ میں شاعری کی تب بھی ان کی انفرادیت نمایاں رہی۔ انھوں نے رجائیت کو اپنی ابتدائی غزلیات میں بھی جگہ دی:

دیکھ اے امید سمجھ ہم سے نہ تو کنارا
تیرا ہی رہ گیا ہے لے دے کے اک سہارا (۵)

ملتے ہی اُن کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا (۶)

وہ امید کیا جس کی ہو انتہا
وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا (۷)

حالی کی انفرادیت ہجر و فراق کے مضامین میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ اپنی شگفتگی کے بل پر غم ہجر کو گوارا بنانے کا ہنر جانتے تھے:

حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں
تھا حوصلہ اُسی کا کہ اتنا صبور تھا (۸)

حالی بتدریج غزل کے موضوعات میں تنوع پیدا کرتے ہوئے مقصدیت کے پیش نظر اہل وطن کو عمل و امید کی راہ پر چلاتے رہے:

کاٹیے دن زندگی کے اُن یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح
سعی سے اُکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح (۹)

حالی غزل میں رنگارنگی کے قائل رہے اس لیے وہ اپنی غزلیات میں غم و آلام روزگار سے نبرد آزما ہونے کے لیے سعی و عمل کرتے ہیں اور انسانی کاوشوں کو بے حد اہمیت دیتے ہیں:

حرماں میں ہاتھ سے نہ دیا رشتۂ امید
اب تک تو ہم جہاں میں بہت شادماں رہے (۱۰)

انسانی امید ذات باری تعالیٰ پر مکمل ایقان پر استوار ہے، یہی وجہ ہے کہ حالی خدائے بزرگ و برتر کو سمیع و بصیر تسلیم کرتے ہوئے یقین رکھتے ہیں کہ انسان کو ان مصائب حیات سے صرف وہی نجات دلا سکتا ہے۔ کہتے ہیں:

مشکلوں کی جس کو حالی ہے خبر
مشکلیں آساں وہی فرمائے گا (۱۱)

حالی نے رباعیات بھی تحریر کیں جن میں وہ انسان کو خدا پر یقین رکھتے ہوئے اپنے عمل سے اس فانی دنیا میں انسانی بقا کا راستہ دکھاتے ہیں:

کیا ہو گی دلیل تجھ پہ اور اس سے زیاد
دنیا میں نہیں ہے ایک دل جو کہ ہو شاد

پر جو کہ ہیں تجھ سے لو لگائے بیٹھے
رہتے ہیں ہر ایک رنج و غم سے آزاد (۱۲)

دنیا کو ہمیشہ نقشِ فانی سمجھو
روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو (۱۳)

عظمتِ انسانی کی دلیل یہ ہے کہ وہ باوفا ہے، خدائے بزرگ و برتر نے اپنے بندوں کو اشرف المخلوقات بنا کر خاک کو کیمیا کا رنگ بخشا ہے:

طبع انساں کو دی سرشتِ وفا
خاک کو کیمیا کیا تو نے
تھا نہ جز غم بساطِ عاشق میں
غم کو راحت فزا کیا تو نے (۱۴)

حالی کی شعری صلاحیتوں کا لوہا منوانے میں 'مد و جزر اسلام' یعنی مسدس حالی کا بڑا ہاتھ ہے جس نے طویل قومی نظم کے حوالے سے اردو ادب میں اوّلیت کا شرف حاصل کیا۔ یہ نظم حالی کی آرزومندی اور دل سوزی کا مرقع ہے۔ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

''مسدس میں قوم کی غیرتی رگ کو حرکت میں لانے کے لیے اسلام اور مسلمانوں کی قومی تاریخ کے پُر فخر کارناموں کو شاید پہلی دفعہ اس طرز و اسلوب سے اس ملک میں بیان کیا گیا تھا۔ رونے کی تسکین کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں مسلمانوں کے فخر و غرور کا سامان بھی تھا۔'' (۱۵)

۱۸۷۹ء میں 'مد و جزر اسلام' جب پہلی دفعہ چھپ کر آئی تو اہلِ اسلام کے عروج و زوال کی داستان کو منفرد انداز میں بیان کیا گیا۔ حالی نبی کریمؐ کی بعثت کو دنیا کی تاریکیوں میں روشنی کا مرکز قرار دیتے ہیں۔ جس سے خاک بطحا کو وہ ہستی عطا کی گئی جس کی آمد کی نوید تمام انبیا سناتے آئے۔ انھی کے وجودِ اطہر کی برکت سے ظلمتوں کا خاتمہ ہوا:

ہوئے محو عالم سے آثارِ ظلمت
کہ طالع ہوا ماہِ برجِ سعادت (۱۶)

بعد ازاں حالی نے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، معاشی ابتری کو بیان کیا جس سے نظم کا اختتامی حصہ افسردگی کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ حالی کا مطمحِ نظر قوم کو دل گرفتہ کرنا نہیں تھا بلکہ وہ انھیں عمل پر آمادہ کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا ۱۸۸۶ء میں حالی نے قوم کے دلوں سے افسردگی کی فضا مٹانے کے لیے اس نظم کا ضمیمہ تحریر کیا جو رجائیت کا مظہر ہے:

بس اے ناامیدی نہ یوں دل بجھا تو
جھلک اے اُمید اپنی آخر دکھا تو
ذرا ناامیدوں کی ڈھارس بندھا تو
فسردہ دلوں کے دل آ کر بندھا تو
ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سر سبز کی ہیں (۱۷)

''مسدسِ حالی'' کا یہ ضمیمہ حرف بہ حرف حرکت وعمل کا پیامبر ہے جس سے یاسیت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ رام بابو سکسینہ اس شہرہ آفاق نظم کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''اس نے کاروانِ مسلم کے لیے جرس کا کام کیا کہ اٹھیں اور آمادہ کار ہوں۔'' (۱۸)

شجاعت علی سندیلوی نے حالی کی اس شعری کاوش کو سراہتے ہوئے اس کے ثمرات کا جائزہ لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''مسدس حالی نے صورِ اسرافیل کا کام کیا۔ سوئی ہوئی قوم جاگ اٹھی۔ اس میں حرکت وعمل کا جذبہ بیدار ہوا۔ اس نے اپنے اخلاق وکردار کو سنوارنے اور سنبھالنے کی کوشش کی۔'' (۱۹)

حالی نے 'انجمن پنجاب' کے تحت موضوعاتی نظمیں لکھیں جن میں 'نشاطِ اُمید' رجائیت کے حوالے سے انفرادیت کی حامل ہے۔ انھوں نے اردو نظم نگاری کو ایک نئی نہج پر ڈال کر اسے ہموار اور روشن کیا اور آنے والوں کے لیے نظم کے دائروں کو وسیع تر کر دیا۔ اُن کی مثنوی 'نشاطِ اُمید' آفاقی نوعیت کا موضوع ہے جس میں حالی نے مذہب، معاشرت، عمرانی وتمدنی مسائل کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ امید کی خوشی اور اہمیت کو بہت موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ ازل تا ابد آس و یاس کی آویزش جاری رہے گی۔ لیکن رجائیت کی بنا پر آلام روزگار کو گوارہ بنایا جا سکتا ہے۔ دلوں میں آرزومندی کے دیے روشن کر کے انسانی حوصلوں کو مہمیز کرنے کا کام صرف رجائیت ہی کر سکتی ہے۔ جیسا کہ حالی کہتے ہیں:

اے مری امید مری جاں نواز
اے مری دل سوز مری کارساز
مری سپر اور مرے دل کی پناہ
درد و مصیبت میں مری تکیہ گاہ
عیش میں اور رنج میں میری شفیق
کوہ میں اور دشت میں میری رفیق
کاٹنے والی غمِ ایّام کی
تھامنے والی دلِ ناکام کی (۲۰)

خاکیوں کی تجھ سے ہے ہمت بلند
تو نہ ہو تو کام ہوں دنیا کے بند (۲۱)

اس نظم کے اختتام پر حالی امید کے قدموں کی برکت کو کچھ اس طرح سے بیان کرتے ہیں:

کان میں پہنچی تری آہٹ جو ہیں
رختِ سفر یاس نے باندھا وہیں
ساتھ گئی یاس کے پژمردگی
ہو گئی کافور سب افسردگی
تجھ میں چھپا راحتِ جاں کا ہے بھید
چھوڑیو حالی کا نہ ساتھ اے اُمید (۲۲)

اس مثنوی میں رجائیت قاری کو حوصلہ مندی کی نئی جہتوں سے روشناس کراتی ہے۔ اس مثنوی 'نشاطِ امید' کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''نشاطِ اُمید کا موضوع پرانا ہونے کے باوجود نیا ہے۔ انسان جس وقت سے پیدا ہوا ہے، اُمید اور اس کی خوشی اس کے دم کے ساتھ ہے۔ وہ ہمیشہ ہر حال میں اس کی رفیق اور دوست ثابت ہوتی ہے۔ مایوسیاں اور ناکامیاں اس کے دم سے گوارا بن جاتی ہیں۔ افلاس اور عسرت میں انسان اس کے سہارے غنی رہتا ہے۔ وہ دکھے ہوئے دلوں کا مداوا ہے، وہ دلوں کو جگاتی اور حوصلوں کو بڑھاتی ہے۔ ارادوں میں اس کی وجہ سے نیا خون دوڑتا ہے۔ انسان کی بلندی کا راز امید ہی میں پوشیدہ ہے۔'' (۲۳)

حالی کی تحریر کردہ نظموں ''تحفۃ الاخوان'' اور ''گدایانِ قوم'' سے بھی رجائیت منعکس ہوتی ہے جہاں اسلاف سے محبت، مسلم ثقافت سے گہرا تعلق اور حالات کا شعور نمایاں دکھائی دیتا ہے:

جب تک ہے انساں میں غیرت کی شان
پتلے میں اس خاک کے باقی ہے آن
قوم کی طاقت کا بڑھانا ہے فرض
قوم کا قرضہ یہ چکانا ہے فرض (۲۴)

نظم ''تحفۃ الاخوان'' کے اختتامیہ اشعار میں کہتے ہیں:

یا کرد کوشش کہ مردہ قوم میں پڑ جائے جاں
اور دکھا دو خلق کو اس راکھ سے اٹھتا دھواں (۲۵)

''مناجاتِ بیوہ'' میں خدا کی ہستی کو بے سہاروں کا اصل آسرا قرار دیتے ہیں:

بے آسوں کی آس ہے تو ہی
جاگتے سوتے پاس ہے تو ہی (۲۶)

جس طرح حالی نے مایوسی کی شکار قوم کو ازسرِ نو زندگی سے ہم کنار کیا اسی طرح شبلی نعمانی نے اپنی انفرادیت کا لوہا سوانح نگاری اور تاریخ نویسی میں ہی نہیں منوایا بل کہ ان کی تخلیقی صلاحیتیں شاعری میں بھی عیاں ہیں۔ امید وعمل سے آمیز ہو کر شبلی کی شاعری اپنے قارئین کو عظمتوں اور رفعتوں سے روشناس کراتی ہے۔ ان کی کلیات میں مثنویات، مسدس، اخلاقی، سیاسی اور مذہبی نظمیں شامل ہیں۔ انھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو عرب تہذیب و ثقافت کی جانب متوجہ کرنے کے لیے کاوشیں کیں۔

شبلی نے سیاسی و تاریخی ہنگامی موضوعات پر طبع آزمائی کا آغاز کیا۔ ان کی شاعری خارجی محرکات اور تحریکوں کی مظہر ہے۔ شبلی تحریک علی گڑھ اور سرسید احمد خان سے غایت درجے کی محبت رکھتے تھے جس کا اظہار انھوں نے مثنوی ''صبحِ امید'' میں کیا۔ یہ نظم اسلامی شان و شوکت، جرأت کا خوب صورت بیان ہے۔ اس میں ان کے موضوعات مذہبی، تاریخی اور طنزیہ نوعیت کے ہیں۔ انھوں نے انجمن پنجاب کے زیرِ اثر شاعری کا آغاز کیا۔ نظم ''صبحِ امید'' میں ابتداءً مسلمانوں کے کارہائے نمایاں بیان کر کے تاریخی صورت حال کا تذکرہ کیا گیا ہے:

یہ اوج وہ خیالِ اُمید
یہ قوم کا نونہالِ اُمید
صد شکر کہ آج بارور ہے
جو شاخ ہے اُس کی پُر ثمر ہے
لایا ہے، وہ برگ و بار کیسا
اعدا کو ہے خار خار کیسا (۲۷)

برصغیر کے بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر مسلمانوں کو مصائب و آلام کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے۔ اس حوالے سے شبلی کہتے ہیں:

ترغیب کے ساتھ ساتھ تجدید
کچھ پاس تو کچھ نوید اُمید (۲۸)

اس نظم کے آخر میں ان کی نگاہ مسلمانوں کے مستقبل پر مرکوز تھی، فرماتے ہیں:

گو دورِ فلک ہوا ہے دگرگوں
پھر بھی تو رگوں میں ہے وہی خوں
اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی
اس راکھ میں کچھ شرر ہیں باقی (۲۹)

شبلی کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر محمد فرمان ان کے شعری موضوعات کا احاطہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ہمت و جرأت، سامراج پر چوٹیں، شہنشاہت کی مخالفت، آزادی کی لگن، مغرب پرستوں کی مخالفت اور علما کو میدان میں آنے کی دعوت، ان نظموں کی واضح خصوصیات ہیں.... شبلی نے واقعی اپنی اردو شاعری کی بدولت ایک طرف ایک ہندوستانی کی حیثیت سے تحریکِ آزادی کو تقویت دی ہے اور دوسری طرف بحیثیت ایک مسلمان کے عالم اسلام کی خدمت کو اپنا شعار بنایا ہے۔'' (۳۰)

حالی کے ساتھ شبلی بھی ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں شرکت کرتے رہے۔ اجلاس منعقدہ ۱۸۸۸ء میں شبلی نسلِ نو کو مستقبل کا امین سمجھتے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ نوجوان اس قوم کو متحد کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس لیے وہ اس نظم میں رجائیت کا اظہار کرتے ہیں:

اب بھی اسلاف کے موجود ہیں جوہر ہم میں
دیکھنا جوش میں آتا ہے یہ دریا کیسا
ہاں کمر بستہ ہو اے قوم ترقی کے لیے
آج کے کام میں اندیشۂ فردا کیسا
نوجوانو! یہ زمانہ کو دکھا دینا ہے
اپنی قوت کو کیا قوم نے یکجا کیسا
قوم کے تازہ نہالانِ چمن ہو تم لوگ
دیکھیں پھل لاتا ہے یہ نخلِ تمنا کیسا (۳۱)

قصیدہ اردو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۳ء میں پڑھا گیا۔ اس میں شکوہ اسلامی کا ذکر کرتے ہوئے شبلی اپنے اسلاف پر فخر محسوس کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

ہماری کلفتیں سب دور ہو جاتی ہیں یہ سن کر
کہ دنیا آج تک اسلام کی ممنونِ احسان ہے
مزے لیتے ہیں پہروں تک کسی سے جب یہ سنتے ہیں
کہ یورپ دولتِ عباس کا اب تک ثناخواں ہے (۳۲)

شبلی نعمانی کے اس قصیدے میں امید، حرکت وعمل اور جوش و جذبہ کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد احسان الحق کلیاتِ شبلی نعمانی کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

''اس میں مسلمانوں کے عروج کے زمانے کے واقعات کے تذکرہ سے ان میں آگے بڑھنے کا جوش پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔'' (۳۳)

اس نظم میں وہ امتِ مسلمہ کو اپنے اسلاف کی عظمتوں اور رفعتوں سے روشناس کراتے ہوئے ان کے نقشِ قدم پر چل کر عمل کی راہ اپنانے پر آمادہ کرتے ہیں:

تمھیں جو کام ہیں درپیش گو مشکل ہیں
مگر کرنے آ جاؤ تو آساں سے ہیں آساں تر (۳۴)

مولانا شبلی کے ہاں عمرانی تغیر (Social Change) کا احساس اور اظہار نمایاں ہے۔ وہ ایک تہذیب کے ساتھ دوسری نئی اور ترقی پذیر تہذیب کو ابھرتا دیکھتے ہیں جس میں زمانے کے ساتھ چلنے، عظمت انسانی کا احساس اور شعور ملتا ہے۔ مفتون احمد اس حوالے سے کہتے ہیں:

"شبلی ایک بڑے شاعر نہ تھے لیکن ایک خوش گوار شاعر تھے۔" (۳۵)

شبلی کی نظمیں بہت ہنگامہ خیز موضوعات پر مبنی تھیں۔ تقسیم بنگال کی منسوخی، جنگِ بلقان اور کئی دینی و ملی معاملات سے متاثر ہو کر انھوں نے نظمیں لکھیں جن میں امید کا رنگ ملتا ہے۔ مثنوی 'صبح اُمید' میں شبلی کہتے ہیں کہ وہ قوم جس نے قیصر وکسریٰ کے چراغ گل کر کے فتح و اقبال کے دروا کیے تھے، تعصبات کا شکار ہو کر اسلام سے دور ہو گئی ہے۔ لیکن وہ مایوس نہیں۔ انھیں امید ہے کہ آج بھی امتِ مسلمہ اگر اپنی اصلاح کرے تو اس راکھ سے چنگاریاں پیدا کی جا سکتی ہیں۔

۱۸۹۴ء میں شبلی نے ایک اور قصیدہ لکھا جس میں کہتے ہیں:

دیکھنا آپ کھڑے ہوں گے ہم اپنے بل پر
غیر سے چارہ نوازی کا تقاضا کیسا
اب بھی اس راکھ میں تھوڑی سے شرر ہیں پنہاں
اب بھی اک فتنہ ہے یہ شاید زیبا کیسا
دیکھنا ذرّہ کا چمکے گا ستارہ اک دن
دیکھنا قطرہ یہ بن جاتا ہے دریا کیسا (۳۶)

شبلی نے جنگ بلقان میں ترکی بھیجے جانے والے وفد کی واپسی پر نظم 'خیر مقدم ڈاکٹر انصاری' سے نظم لکھی جس میں اپنے بھائیوں کی بے لوث خدمت، غم خواری، ہمدردی اور جذبہ اسلامی سے معمور ہو کر اخوت کا مظاہرہ کرنے پر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مجاہدین کی جرأت مندی پر ان کی کامیابیوں کی امید کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں:

سہارا ہے اگر اُمید کا اب بھی کوئی باقی
تو تم نے وہ رموز قوت مکنوں بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اُچھل آئے
کہ ہم نے انقلابِ چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں (۳۷)

الغرض حالی اور شبلی نے اپنی تخلیقی کاوشوں کو اپنی قوم کی اصلاح کے لیے صرف کرتے ہوئے ان کی خامیوں سے نہ صرف پردہ اٹھایا، بل کہ انھیں شان دار اسلامی تاریخ سے آگاہ کرتے ہوئے مسلم نشاۃ ثانیہ کی امید بھی دلائی ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں اس عہد کے دانش وروں میں مایوسی کے مشترکہ احساس کو بیان کرتے ہوئے ہمارے بعض

شعرا کی نظموں میں امید افزا دعاؤں کی نشان دہی بھی کی ہے تا کہ مستقبل میں امیدوں کے دیے روشن کیے جا سکیں۔ وہ کہتے ہیں:

> "اردو کی قومی اور ملی شاعری میں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اس عہد کے شاعروں نے آشوب کی انتہا کے دوران بھی رجائیت اور اُمید کے احساس کو گم نہیں کیا۔" (۳۸)

بے شک حالی وشبلی کی شاعری بھی اسی احساس کی لَو سے اپنے عہد کی ظلمتوں کے خلاف صف آرا دکھائی دیتی ہے۔

حوالے:

(۱) محمد اقبال، کلیاتِ اقبال (اردو)، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۵ء، ص ۲۲۲
(۲) پروفیسر آل احمد سرور، "اقبال، فیض اور ہم" مشمولہ فیض احمد فیض کی شاعری۔ مرتبہ؛ اشتیاق احمد۔ لاہور: کتاب سرائے، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۷
(۳) اختر پرویز۔ "تصورِ رجائیت"، مشمولہ تصوراتِ اقبال۔ مرتبہ؛ سید اسعد گیلانی۔ لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۰ء، ص ۲۱۵
(۴) مولانا الطاف حسین حالی۔ کلیاتِ نظم حالی۔ جلد اوّل، مرتبہ؛ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء۔ ص ۱۲۱
(۵) مولانا الطاف حسین حالی۔ کلیاتِ حالی۔ ص ۹۲
(۶) مولانا الطاف حسین حالی۔ کلیاتِ نظمِ حالی۔ جلد اوّل۔ مرتبہ؛ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء۔ ص ۵۹
(۷) ایضاً ، ص ۶۳
(۸) ایضاً ، ص ۶۱
(۹) ایضاً ، ص ۱۱۲
(۱۰) ایضاً ، ص ۱۶۰
(۱۱) ایضاً ، ص ۱۰۱
(۱۲) ایضاً ، ص ۲۱۹
(۱۳) ایضاً ، ص ۲۲۴
(۱۴) ایضاً ، ص ۸۰
(۱۵) سید سلیمان ندوی۔ مقدمہ مسدس حالی (صدی ایڈیشن)۔ کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۹۲ء، ص ۴۱
(۱۶) شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی۔ کلیاتِ نظمِ حالی۔ جلد دوم۔ مرتبہ؛ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۰ء، ص ۶۳
(۱۷) ایضاً ، ص ۱۳۶
(۱۸) رام بابو سکسینہ۔ تاریخ ادب اردو۔ مترجمہ؛ مرزا حسن عسکری۔ لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۸۶ء۔ ص ۳۸۵

(۱۹) شجاعت علی سندیلوی۔ حالی بحیثیت شاعر۔ لکھنو: ادارۂ فروغِ اردو، ۱۹۶۰ء۔ ص ۲۶۹
(۲۰) مولانا الطاف حسین حالی۔ کلیاتِ نظمِ حالی۔ جلد اوّل۔ مرتبہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ ص ۳۸۴، ۳۸۵
(۲۱) ایضاً ۔ ص ۳۸۷
(۲۲) ایضاً ۔ ص ۳۹۱
(۲۳) عبادت بریلوی، ڈاکٹر۔ جدید شاعری۔ لاہور: اردو دنیا، ۱۹۶۱ء، ص ۱۲۸
(۲۴) مولانا الطاف حسین حالی۔ کلیاتِ نظمِ حالی۔ جلد دوّم۔ مرتبہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ ص ۲۶۰
(۲۵) ایضاً ۔ ص ۲۷۰
(۲۶) مولانا الطاف حسین حالی۔ کلیاتِ نظمِ حالی۔ جلد دوّم۔ مرتبہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ ص ۷
(۲۷) مولانا شبلی نعمانی۔ کلیاتِ شبلی۔ مرتبہ: ڈاکٹر محمد احسان الحق، ص ۵۸
(۲۸) مولانا شبلی نعمانی۔ کلیاتِ شبلی۔ مرتبہ: ڈاکٹر محمد احسان الحق، ص ۳۵
(۲۹) مولانا شبلی نعمانی۔ کلیاتِ شبلی۔ مرتبہ: ڈاکٹر محمد احسان الحق، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۶۵
(۳۰) محمد فرمان۔ ''شبلی نعمانی''۔ مشمولہ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند۔ اردو ادب، جلد چہارم۔ لاہور: جامعہ پنجاب، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۸
(۳۱) مولانا شبلی نعمانی۔ کلیاتِ شبلی۔ مرتبہ: ڈاکٹر محمد احسان الحق، ص ۸۸
(۳۲) ایضاً ، ص ۷۷
(۳۳) ایضاً ، ص ۸
(۳۴) ایضاً ، ص ۷۹
(۳۵) مفتون احمد۔ مولانا شبلی نعمانی – ایک مطالعہ۔ کراچی: مکتبۂ اسلوب، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱
(۳۶) مولانا شبلی نعمانی۔ کلیاتِ شبلی۔ مرتبہ: ڈاکٹر محمد احسان الحق، ص ۸۶
(۳۷) ایضاً ۔ ص ۱۶۰
(۳۸) ڈاکٹر سہیل احمد خان۔ ''قومی و ملی شاعر''۔ مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند۔ اردو ادب، (جلد چہارم) لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء، ص ۲۳۳

شبلی نعمانی اور ظفر علی خان

ڈاکٹر زاہد منیر عامر

ABSTRACT:

Molana Muhammad Shibli Nomani (4 June 1857.... 18 November 1914) and Molana Zafar Ali Khan (January 1873.... 27 November 1956) are great literary figures of Muslim sub continent. This article deals with their relations and unfolds the facts that Zafar Ali Khan was a student of Molana Shibli Nomani, who attended his lectures at Ali Garh in B.A classes. He composed poetry in the praise of his teacher and translated his works in English, both prose and poetic. During their stay in Hyderabad Deccan state they enjoyed company of each other as well.

Keywords: Shibli , Zafar Ali Khan, Ali Garh, Haiderabad, Kan pur, translations, Turks

شمس العلما مولانا محمد شبلی نعمانی (۴رجون ۱۸۵۷ء......۱۸رنومبر ۱۹۱۴ء) علی گڑھ کالج کا مایہ افتخار ہیں۔ وہ فروری ۱۸۸۳ء سے اواخر ۱۸۹۸ء تک اس تاریخی درس گاہ سے وابستہ رہے۔ وہ یہاں عربی کے استاد اور طلبا کی ادبی تربیت کے لیے قائم کی گئی مجلس لجنۃ الادب کے نگران تھے۔ کم وبیش سولہ سال کی اس مدت میں انھوں نے بہت سی جماعتوں کو درس دیا اور کئی نسلوں کی ذہنی آبیاری کی۔ علی گڑھ میں ان کے دامن تربیت اور خوانِ علم و فضل سے وابستہ رہنے والوں میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا حمید الدین فراہی، مولوی عزیز مرزا، خواجہ غلام الثقلین، مولوی عبدالحق، سید محفوظ علی بدایونی، ڈاکٹر سر ضیاء الدین اور چودھری خوشی محمد ناظر جیسے لوگ شامل ہیں۔ اس سلسلۃ الذہب میں مولانا ظفر علی خان (۱۸۷۳ء......۱۹۵۶ء) کا نام بھی شامل ہے [۱] بلکہ کہنا چاہیے کہ مولانا شبلی کے تلامذہ میں قومی سطح پر خدمات انجام دینے والوں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ظفر علی خان ۱۸۹۲ء میں انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ میں داخل ہوئے اور انھوں نے ۱۸۹۵ء میں فسٹ ڈویژن میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔

اس دوسالہ قیام کے دوران میں ظفر علی خان کوشبلی کے علم وفضل اور ان کی شخصیت سے کسب فیض کے خوب مواقع ملے ۔" مولانا شبلی غضب کے مردم شناس تھے وہ عام طلبہ پر ضرورت سے زیادہ توجہ نہ دیتے لیکن جن طلبہ میں علمی صلاحیت پاتے وہ التفات خصوصی کے حق دار ٹھہرتے انھیں تحریر وتقریر کی مشق کراتے تحقیق کی رغبت دلاتے ......" ؎ ظفر علی خان بھی ان طالب علموں میں سے تھے جنھیں مولانا شبلی کی خاص توجہ حاصل رہی اسی لیے انھیں مولانا شبلی کے" مخصوص تلامذہ" ؎ میں شمار کیا جاتا ہے اس زمانے میں مولانا شبلی کا درس قرآن مشہور تھا۔ظفر علی خان ان کے درس میں شریک ہونے والوں میں شامل تھے ؎ اس درس سے اثر پذیری کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مولانا شبلی کو خداوند کریم نے لحن داؤدی سے نوازا تھا وہ جب قرآن کی تلاوت کرتے تو گویا قلوب کو مسخر کرلیا کرتے تھے ؎ ظفر علی خان نے اس دوران میں جہاں علمی اعتبار سے مولانا شبلی سے اکتساب فیض کیا وہاں تقریر وتحریر میں بھی مولانا نے ان کی شخصیت پر اثرات مرتب کیے۔ظفر علی خان ایک طالب علم کی حیثیت سے لجنۃ الادب کے رکن تھے اور مولانا شبلی لجنۃ الادب کے نگران کی حیثیت سے طالب علموں کو تقریر وتحریر کا ملکہ سکھاتے تھے ۔اس تعلق کے بہت دوررس نتائج نکلے۔ظفر علی خان کی شخصیت اور ان کے فن نے اس تجربے سے گہرے اثرات قبول کیے۔ظفر علی خان کے مضامین اور اسلوب پر بھی شبلی کا اثر محسوس کیا جاسکتا ہے شبلی کی علمی تحریریں الگ اندازکی حامل ہیں البتہ عصری سیاسی مسائل پر ان کا انداز کہیں کہیں ظفر علی خان کے ہاں بھی دکھائی دے جاتا ہے اور شبلی ہی کی طرح ظفر علی خان کی نثر میں بھی خطیبانہ لہجہ اور شاعرانہ اسلوب دکھائی دیتا ہے ۔یہ اثر پذیری نثر تک محدود نہیں بلکہ شاعری کی دنیا تک بھی پھیلی ہوئی ہے۔ظفر علی خان کے ہاں قومی شاعری کا جو رنگ روپ دکھائی دیتا ہے اس پر بھی شبلی کے اثرات کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ظفر علی خان سے پہلے شبلی ہی تھے جنھوں نے عصری سیاسی حالات و واقعات کو شعر کا پیراہن عطا کیا اور اس موثر ذریعہ ابلاغ کو قومی جذبات کی بیداری کے لیے استعمال کیا کلیات شبلی کی سیر ہمارے اس دعوے کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کردیتی ہے ۔یوں تو اپنے والد کے زیر اثر ظفر علی خان کی بنیادی تربیت ہی میں قومی خدمت کا جذبہ شامل تھا لیکن علی گڑھ کی فضا نے اس جذبے کو خوب چمکایا اور اس میں جہاں سرسید کے پیدا کردہ ماحول کا اثر تھا وہاں ظفر علی خان کے استاد گرامی مولانا شبلی نعمانی کا فیضان بھی تھا۔نوجوانی اور طالب علمی کے زمانے میں ظفر علی خان نے کچھ عاشقانہ غزلیں کہیں تو استاد گرامی نے ان کی حوصلہ شکنی کی۔ظفر علی خان کی اپنی طبیعت بھی تنگنائے غزل سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں رکھتی تھی اس پر استاد کی ہدایت مستزاد ہوئی۔انھوں نے فروری ۱۹۲۸ء کی ایک ریڈیائی تقریر میں اس بیتے زمانے کی بازآفرینی کرتے ہوئے بتایا

> " مجھے خوب یاد پڑتا ہے کہ ایک دفعہ جب میں نے ایک طرحی غزل کہی جو لکھنو کے ایک گلدستہ میں چھپ گئی اور استاذی شبلی مرحوم کی نظر سے گزری تو مرحوم نے مجھے سختی سے ڈانٹا اور فرمایا کہ آئندہ اس قسم کی خرافات کا سلسلہ جاری رکھا تو جماعت میں نہ آنے دیا جائے گا۔اس کا اثر یہ ہوا کہ میں نے عاشقانہ غزل سرائی سے توبہ کرلی اور نظم میں اظہار خیالات کا ایک نیا رستہ تجویز کرلیا جس کا نقشہ سالہاسال بعد میں نے یوں کھینچا: ......" ؎

شبلی ایک محبوب استاد تھے ان کا انداز تدریس طالب علموں کو اپنی جانب متوجہ کر لینے والا تھا وہ ''شاعر، ادیب اور مورخ تھے ان کی جماعت میں بیٹھ کر جی خوش ہوتا تھا موقع موقع سے ادبی نکات اور اساتذہ کے اشعار اور لطائف سنا کر تاریخی واقعات اس طرح بیان کرتے تھے کہ درس کا حق ادا ہو جاتا تھا'' ۷ ایسے استاد کی بات طالب علموں پر زیادہ اثر کرتی ہے اور پھر جب اس کے پیچھے جذبے کا چراغ بھی روشن ہو تو بات کی تاثیر اور بڑھ جاتی ہے۔ ایسا ہی ہوا اور ظفر علی خان تاریخی، اخلاقی اور سیاسی موضوعات کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس میں اس قدر ریاض کیا کہ اب سیاسی، تاریخی اور اخلاقی شاعری کی تاریخ ظفر علی خان کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، یہی استاد گرامی کی خواہش تھی۔

خود شبلی کے ہاں قومی شاعری کا ظہور علی گڑھ کے ماحول کے زیر اثر ہوا، علی گڑھ جانے سے پہلے وہ قدیم خیالات کے شخص تھے اور بہ قول خود'' حرف بہ اردو زدن آئین نہ بود'' ان کا دستور تھا اس دور میں وہ تسنیم تخلص کرتے تھے اور رواجِ عام کے مطابق عشقیہ شاعری کو پسند کرتے تھے'' لیکن علی گڑھ آنے کے بعد ان کی شاعری کا محور بدل گیا اور غزلوں کی جگہ قومی نظموں نے لے لی'' ۸ قیام علی گڑھ کے زمانے میں انھوں نے تین چار سے زیادہ غزلیں نہیں کہیں وہ بھی محض ہیئت کی حد تک غزلیں ہیں زیادہ توجہ مثنوی مسدس اور قصیدے کی طرف رہی چنانچہ علی گڑھ میں ان کا اپنے شاگرد کو قومی شاعری کی طرف متوجہ کرنا قابلِ فہم ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ جب شبلی حیدر آباد چلے گئے تو ''دکن کے کیف آور ماحول میں ان کا ابتدائی ذوق پھر ابھر آیا اور انھوں نے اردو غزلیں لکھیں افسوس کہ یہ غزلیں محفوظ نہیں رہیں'' ایک خط میں نقل کیے جانے والے کچھ اشعار سے ان کے رنگ ڈھنگ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۹۔ واضح رہے کہ یہ بات محض اردو کلام کی ہو رہی ہے فارسی شاعری میں تو شبلی کا تغزل مسلسل روز افزوں رہا۔ ادھر شاگردِ عزیز ظفر علی خان تھے کہ انھوں نے غزل کو ایسا چھوڑا کہ پھر اس کا نام تک نہ لیا حیدر آباد کے زمانے میں ان کی اکا دکا غزل دکن ریویو کے صفحات پر ابھری لیکن شاعر کے نام کے اخفا کے ساتھ ۱۰

سر دست باب غزل میں داخلہ مقصود نہیں، ذکر ہے علی گڑھ میں ظفر علی خان کی طالب علمی کا..... روم و مصر و شام کے سفر کے دوران جب ترکی حکومت نے مولانا شبلی کو تمغہء مجیدی عطا کیا تو واپسی پر ہندوستان کی برطانوی حکومت نے مولانا شبلی نعمانی کو شمس العلما کا خطاب دینے کا اعلان کیا اس مناسبت سے علی گڑھ کالج میں ۱۹ر جنوری ۱۸۹۴ء کو ایک تہنیتی جلسہ ہوا جس میں کالج کے اکابر سر سید احمد خان، سید محمود، نواب محسن الملک، مولانا حالی، مولوی نذیر احمد، نواب مزمل اللہ خان، پروفیسر آرنلڈ، سید کرامت حسین نے خطاب کیا۔ مولانا حالی، مولانا حمید الدین فراہی اور مولوی بہادر علی نے عربی قصائد پیش کیے۔ ظفر علی خان نے اس مجلس میں اپنے جلیل القدر استاد کی عظمت کا منظوم اعتراف کرتے ہوئے فارسی قصیدہ پیش کیا اگرچہ یہ قصیدہ ان کے دور طالب علمی کی تصنیفات سے ہے لیکن بہ قول سید سلیمان ندوی ''سالی کہ نکوست از بہارش پیداست'' کا مظہر ہے ۱۱

سحر گاہاں دلم پامال غم بود و پریشانی مکدر مطلع خاطر بہ از اندوہ پنہانی
گہی بر بی سر و سامانی خود نالہ ی کردم گہی خواندم حدیثِ گردشِ ایامِ طولانی

گہی بر کردۂ خود انفعالم وست ی دادی — گہی کردہ نظر بر معصیت خوردم پشیمانی
چو موجِ غم ز سر بگوشت گشتم عازمِ گلشن — کہ درمانِ دلِ زارم شود زان سان بہ آسانی
شگفتہ غنچۂ دل شد ز فرطِ فرحت و بہجت — عروسِ دہر را پیرایۂ دیدم چو نورانی
گل و بلبل بہم محوِ ادا و عشوہ و غمزہ — چو زلفِ مہ وشاں گیسوی سنبل در پریشانی
خرامِ ناز کبک و رقصِ سرو و خندۂ گل ہا — دلم برد و شدہ روحم نثارِ صنع یزدانی
دمیدہ لالۂ حمرا کنارِ جویِ کوثر وش — ہمی شد از جمالش غرقِ خوں، لعلِ بدخشانی
وزید از گلستان بادِ صبا آہستہ آہستہ — مشامِ جان معطر شد ز بوی مستِ ریحانی
گلاب و نسترن، شبو و نسرین، نرگس و سوسن — بہر یک عشوۂ خاصی بد از انداز ارزانی
ز شبنم لالہ داغِ خود بہ اندازِ نکو شستہ — شمیم یاسمین و یاسمن در عنبر افشانی
ہزاران مرغِ خوش الحان نشستہ بر سرِ اغصان — بصوتِ دلربا بودند محوِ تہنیت خوانی
مہِ نو کشتیِ بہرِ نثار از نقرہ پُر کردہ — کواکب بر فلک مصروف ہر سو در دُر افشانی
چو این نظارہ را دیدم بہ جیبِ فکر سر بردم — کہ بہرِ کیست این آرائش و تزئینِ لاثانی
درین اثنا مرا از ہاتفِ غیبی ندا آمد — نمی دانی مگر تو ای غریقِ بحرِ حیرانی
کہ فخرِ قوم مولانای شبلی را پیِ علمش — خطابی شد عطا واللہ ز فیضِ جُودِ سلطانی
زمین ہم آسمان ہم چہرہ افروزند بہر او — معطر باغِ دہر است از پیِ شبلیِ نعمانی
بحمد اللہ کہ دُرِّ درجِ حکمت را پس از عمرے — ز عدلِ خسروی شد گرم بازارِ درخشانی
نہ یارایِ ثنای تو قلم را نی زبانم را — قطار عالمان انجم، میانش شمس تابانی
کنند ای کانِ معنی علم و فضل و دانش و حکمت — بیک پا ایستادہ بر جنابت پاستان بانی
زمینِ شعر از فیضت پر از گلہایِ بو قلموں — سخن را دادہ ای سرمایہ، ای بحرِ سخن دانی
کند پہنایِ مضمونِ لطیف و خوش بیک دم طی — سمندِ کلکِ تو ہر گہ شود سر گرم جولانی
براقی دادہ ای از فکر خود عرفی و صائب را — کجا ہم پایہ ات باشند خاقانی و قاآنی
بہاران فحۂ باشد ز گلزارِ کمال تو — ز بہر عقل و فہمت رشحۂ ابریست نیسانی
خداوندِ کریمت لحنِ داؤدی عطا کردہ — کنی تسخیر دل ہا چو کنی ترتیل قرآنی
نوایِ نغمہ ہای شکرین تا خیزد از گلبن — صدائے بلبل آید تا ز شاخِ سروِ بستانی

ز چشمِ زخمِ دوران در سلامت باشی و ایمن
معین و یاور و ناصر ترا تائیدِ ربانی

علی گڑھ میں تعلیم کی تکمیل کے بعد ظفر علی خان کو ملازمت کی ضرورت تھی۔ انگریز کی ملازمت وہ کرنا نہیں چاہتے تھے یوں بھی اس کا تجربہ انھیں اپنے والد کے ساتھ محکمہ ڈاک میں کچھ وقت گزار کر ہو گیا تھا۔ ان کی اس مشکل کو مولانا شبلی

نعمانی نے حل کیا۔ نواب محسن الملک (۹ دسمبر ۱۸۳۷ء۔ ۱۶اکتوبر ۱۹۰۷ء) کو انگریزی خط کتابت اور اپنے دوسرے علمی منصوبوں کے لیے کسی معاون کی ضرورت تھی ، پہلے خواجہ غلام الثقلین (م: ۳ستمبر ۱۹۱۵ء) ان کی یہ خدمت انجام دیتے رہے تھے۔ ایک نئے گریجوایٹ اور باصلاحیت نوجوان کے طور پر اب ظفرعلی خان ،ان کے لیے بہترین انتخاب ہوسکتے تھے۔ مولانا شبلی نے اس مقصد کے لیے اپنے لائق شاگرد کا نام تجویز کیا اور ظفر علی خان ان کی اس تجویز پر نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سیکریٹری مقرر ہوگئے۔ یہ تعلق ان کی علمی زندگی کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کرگیا اور انھوں نے یہاں رہ کر صرف نواب محسن الملک ہی کی نہیں بلکہ پوری اردو دنیا کی خدمت انجام دی۔ نواب محسن الملک انگریزی تحقیقات اور نئے فن پاروں کو اردو میں منتقل کروانے کے شائق تھے چنانچہ ان کے ایما پر ظفرعلی خان نے جہاں ان کے ذاتی معاون کے طور پر خدمت انجام دی اوران کے لیے فلسفے کے مضامین کا اردو ترجمہ کرتے رہے وہاں انھوں نے سائنس اور مذہب کے موازنے پر مشتمل جان ولیم ڈریپر کی مشہور کتاب ۱۲ کا اردو ترجمہ معرکہ مذہب و سائنس کے نام سے کیا۔ نواب صاحب کی علمی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے ظفرعلی خان نے اس کتاب کے انتساب میں لکھا کہ محسن الملک کا''نام مسلمانان ہند کی تاریخ میں آب زر سے لکھا جاچکا ہے'' انھی کی ''تحریک پر میں نے آج سے پندرہ سال پہلے اس کتاب کا ترجمہ اردو میں کیا تھا''۔۱۳

یہ وہ زمانہ تھا جب شبلی خود ریاست حیدرآباد سے وابستہ ہوچکے تھے۔ ایک بار وہ حیدرآباد سے بمبئی آئے تو انھوں نے ظفرعلی خان کو بھی حیدرآباد آنے کا مشورہ دیا۔ نواب محسن الملک نے بھی تائید کردی ،ادھر ظفرعلی خان خود انگریزی ملازمت سے نفور اور کسی مسلم ریاست میں جاکر قسمت آزمائی کرنے کے خواہش مند تھے گویا یہ تو پہلے ہی ان کے دل میں تھا۔ وہ اس مشورے پر فوراً ہی عمل پیرا ہوگئے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے ظفرعلی خان لکھتے ہیں:

> ''بی اے کے امتحان سے فارغ ہوکر میں سیدھا نواب محسن الملک مرحوم کے پاس بمبئی چلا گیا جنھیں خواجہ غلام الثقلین مرحوم کی علیحدگی کے بعد ایک پرائیویٹ سیکریٹری کی ضرورت تھی ان علمی مشاغل کے لیے جن کے ساتھ مجھے آج تک دل بستگی ہے میں محسن الملک علیہ الرحمہ ہی کے فیض تربیت کا رہین احسان ہوں ،ایک سال اس طور پر گزارا تھا کہ استاذی و ملاذی علامہ شبلی مغفور سفر حیدرآباد سے واپسی پر بمبئی ٹھہرے اور مجھے حیدرآباد جاکر قسمت آزمائی کرنے کی صلاح دی یہ عین میرے دل کا مدعا تھا۔۔۔''۱۴

یہاں سے ظفرعلی خان کی علمی و عملی زندگی کا ایک اہم دور شروع ہوتا ہے۔ وہ شبلی کی تجویز اور محسن الملک کی سفارش پر حیدرآباد پہنچ جاتے ہیں شبلی ۱۸۹۹ء میں یہاں آچکے تھے اب ظفرعلی خان کو ایک بار پھر اپنے اس آئیڈیل استاد کی صحبت اور راہ نمائی میسر آگئی اس پر اظہار مسرت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ ہم حیدرآباد میں ''شبلی جیسے وحید العصر و یکتائے زمن کے خرمن فیض سے خوشہ چینی کررہے ہیں اور حالی کی عدیم النظیر سخنوری و سخن سنجی سے مذاق سلیم کو بہرہ اندوز بنارہے ہیں'' ۱۵ ظفرعلی خان کی زندگی کا یہ زمانہ ہم مذاقوں اور دوستوں کی صحبت کے باعث کس قدر خوش کن اور پرثروت گزرا اس کا اندازہ اس کیفیت سے لگایا جاسکتا ہے جس کا اظہار مولوی

عبدالحق نے اس طرح کیا ہے کہ ''ایک روز مولوی عزیز مرزا مولوی ظفر علی خان (سید علی) مرحوم کے یہاں مدعو تھے بارہ بجے کھانے کے بعد سے چار بجے تک مولوی شبلی اساتذہ کے اشعار سناتے رہے جس سے سامعین بہت محظوظ ہوئے''۔ ۱۶

حیدرآباد کے اسی زمانے میں ظفرعلی خان نے دکن ریویو جاری کیا جس میں انھیں مولانا شبلی کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ دکن ریویو کے متعدد شماروں میں مولانا کی تحقیقات کی اشاعت ظفرعلی خان کے ساتھ ان کے تعاون اور خورد نوازی کا پتا دیتی ہے۔ ہم نے دکن ریویو کے متعدد شماروں میں مولانا شبلی کا کلام دیکھا ہے یہی نہیں دکن ریویو میں ان کے مقالات بھی شائع ہوتے رہے ۱۷۔ ظفرعلی خان نے اس قلمی تعاون کا اعتراف کرتے ہوئے دکن ریویو کے ایک اداریے میں لکھا:

> ''سب سے زیادہ شکریہ کے مستحق ہمارے قلمی معاونین ہیں جن کے بغیر دکن ریویو، دکن ریویو نہ ہو۔ یورپ اور امریکہ میں مضمون نگار بے معاوضہ لیے کچھ نہیں لکھتے۔ ہمارے ملک میں ایسے لوگ جو مضمون لکھ سکتے ہیں اور وہ بھی ایسا کہ دکن ریویو میں اندراج کے قابل ہو اول تو ہیں ہی گنتی کے اور دوسرے انھیں صلہ کی پروا نہیں۔ شکر ہے کہ جن اصحاب نے ہمارے لیے مضمون لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی وہ اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہیں اور ان کی توجہات کے شکرگزار۔ اصحاب ذیل کی عنایات کا سلسلہ اگر اسی طرح قائم رہا تو ترقی کا کوئی درجہ نہیں جو دکن ریویو طے نہ کر سکے۔''

ان اصحاب میں شبلی کا نام ''علامہ شبلی نعمانی اعظم گڑھ'' شمار چار پر شامل ہے۔ ۱۸ دکن سے پنجاب آجانے کے بعد جب ظفرعلی خان نے دکن ریویو کو پنجاب ریویو کا نام دے کر ازسرنو جاری کیا تو اس وقت بھی مولانا شبلی کا تعاون جاری رہا اور وہ پنجاب ریویو میں بھی لکھتے رہے۔

ادھر استاد گرامی کے لیے ظفرعلی خان کے دل میں عقیدت کے جذبات موج زن تھے۔ ۱۹۰۶ء میں مولانا شبلی کی کتاب موازنہ انیس و دبیر منظر عام پر آئی تو بعض اطراف سے اس پر ناروا تنقید کا سلسلہ شروع ہو گیا ایک صاحب نے المیزان کے نام سے اس کا جواب لکھا۔ ایک اور صاحب نے جو خود کو ''شمس الشموس اوج سخنوری قمرالاقمار بروج نکتہ وری'' کہتے تھے ۲۷ صفحات کے ایک رسالے کی شکل میں ردالموازنہ کے عنوان سے مولانا کی کتاب کا رد لکھا۔ یہ جواب خوش ذوقی کا مظہر نہیں تھا ظفرعلی خان نے اس جواب پر گرفت کرتے ہوئے دکن ریویو کے اگست ۱۹۰۸ء کے ایڈیٹوریل میں اس کا جواب الجواب لکھا کہ:

> ''یہ کتاب مجموعہ ہے ان بازاری گالیوں، سوقیانہ پھبتیوں کا جو لکھنو کے نوابی دور نے اس برگشتہ بخت شہر کے اراذل واوباش کے ترکے میں چھوڑے ہیں اور نتیجہ ہے ایک ایسے شخص کے قلم کا جو مخالف سے معقولیت کے ساتھ عہدہ برآ نہ ہو کر گالیوں پر اتر آتا ہے اور اس پر دو چار قحش آوازے کس کر اپنے ہم مشربوں اور ہم چشموں میں اپنا اعتبار قائم کرنا چاہتا ہے''۔ ۱۹

صاحب **ردالموازنہ** نے شبلی پر تنقید کرتے ہوئے ان کے نام کو بھی نشانہ تحقیک بنایا تھا تبصرہ نگار اس پر تبصرہ کرتے ہوئے **ردالموازنہ** کے مصنف پر اسی کے انداز میں تنقید کرنے لگتا ہے:

"اگر کسی کے نام کی تضحیک سے اور وہ بھی اس پیرایے میں جو لکھنو کے ادانی و اقاصی ہی کا حصہ ہو سکتا ہے صاحب **ردالموازنہ** سمجھتے ہیں کہ انھوں نے موازنہ کی تردید کا حق ادا کر دیا تو **ردالموازنہ** پر رائے زنی کرتے وقت ہمیں بھی پورا حق حاصل ہے کہ جس طرح انھوں نے نعمان کا وزن شبان بتایا ہے ہم بھی بلحاظ اس نسبت و عقیدت کے جو انھیں مرزا دبیر سے ہے ڈیری بروزن نصیری کا گاگر ما گرم فقرہ ان پر چست کر کے سمجھ لیں کہ ہم تنقید کے حق سے عہدہ برآ ہو گئے لیکن ثقاہت مانع آتی ہے کہ ہم اس قسم کے عامیانہ استدلال سے کام لیں" ۲۰

آخر میں البتہ تبصرہ نگار معترض کو ایک اچھا مشورہ دیتا ہے

"بہتر ہو اگر افضل علی صاحب بجائے **ردالموازنہ** لکھنے کے جس کی قیمت اس سیاہی کے داموں کے برابر بھی نہیں جو اس کے سیاہ کرنے میں صرف ہوئی دبیر کے کلام کا ایک صحیح ایڈیشن شائع کرنے کی کوشش کرتے" ۲۱

درمیان کے تند و تیز جملوں کو چھوڑ کر اختتامِ کلام پر تبصرہ نگار نے معترض کو ایک نہایت معقول تجویز پیش کر دی ہے اور وہ یہ ہے کہ بجائے ان اشعار کے انتساب کا انکار کرنے کے جو کہ جعل اعتراض ہیں اپنے ممدوح کے کلام کے متن کو صحت کے ساتھ مرتب کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مشورہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے اور صرف مرزا دبیر ہی کے باب میں نہیں بلکہ تمام کلاسیکی شعرا کے حوالے سے یہ ایک اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیام حیدر آباد کا یہ زمانہ مولانا شبلی نعمانی اور ظفر علی خان دونو ہی کے لیے خوش گوار تجربہ تھا اور دونو ہی حاسدوں کی نگاہوں کا شکار ہوئے۔ ظفر علی خان کی **ستارہ صبح** میں شائع ہونے والی ایک تحریر سے جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے، حیدر آبادی صحبتوں کا خوش گوار نقشہ ابھرتا ہے اس نقشے میں مولانا حالی کی آمد اور داغ دہلوی کی وہاں موجودگی کو بھی شامل کر کے دیکھیں تو اس کا رنگ روغن اور زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ مولانا حالی کی حیدر آباد آمد کے حوالے سے مولوی عبدالحق نے ایک دل چسپ واقعہ لکھا ہے جس سے مولانا حالی کی دل سوزی و اخلاص اور ظفر علی خان کی مشرقی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ظفر علی خان شاگرد تو شبلی کے تھے لیکن وہ اپنے دوسرے بزرگوں کے سامنے بھی شاگردوں ہی کی طرح مودب اور سر جھکائے دکھائی دیتے ہیں۔ ظفر علی خان کے اخلاق و آداب کی جو تصویر مولوی عبدالحق کی تحریر سے ابھرتی ہے ویسی ہی تصویر ان خطوط سے بھی نمایاں ہوتی ہے جو انھوں نے اکبرالہ آبادی کے نام لکھے تھے ۲۲ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"ایک بار مولانا ظفر علی خان نے اپنے رسالہ دکن ریویو میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کتاب یا رسالے پر شائع کیے، جن میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا جن دنوں مولانا حالی حیدر آباد آئے تھے مولانا ظفر علی خان سے ان کی ملاقات ہوئی اور دوران گفتگو میں

> انھوں نے متذکرہ مضامین کے متعلق ظفر علی خان صاحب کو ایسے شفقت آمیز پیرائے میں نصیحت کرنا شروع کی کہ ان سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ سنا کیے مولانا نے یہ بھی فرمایا میں تنقید سے منع نہیں کرتا تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے یہاں میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مولانا شبلی کو مولانا حالی سے کوئی بغض نہ تھا وہ بھی ان کی علمیت سے قائل تھے جب مولانا کو شمس العلما کا خطاب ملا تو مولانا شبلی نے مجھ سے فرمایا اب اس خطاب کی عزت بڑھ گئی !!" ۲۳

اس اقتباس میں شبلی کی کسی کتاب پر تبصرے میں بے جا شوخی کا جو ذکر ہے وہ ظفر علی خان کی مذکورہ بالا سعادت مندی سے میل کھاتا دکھائی نہیں دیتا۔ ہوسکتا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کی یادداشت میں **موازنہ انیس ودبیر** کی حمایت میں لکھا جانے والا وہی مضمون ہو جس کے کچھ اقتباسات قارئین سطور بالا میں ملاحظہ فرما چکے ہیں جو **موازنہ انیس ودبیر** کی حمایت میں لکھا گیا۔ شوخی ومخالفت کا مظاہرہ اگر ہوا ہے تو وہ **ردالموازنہ** کے مصنف کی نسبت سے ہے نہ کہ شبلی نعمانی کے لیے، جن کی تائید وحمایت کے لیے مضمون لکھا گیا ہے۔ مولانا حالی کی جو گفتگو مولوی صاحب نے نقل کی ہے وہ عین ان کی شخصیت کے مطابق ہے جن کا معیار اخلاق مخالف کے لیے بھی وہی ہے جو ممدوح کے لیے ہے اور اس میں شبہ نہیں محولہ بالا تبصرے میں ظفر علی خان کے قلم کی شوخی اس معیار سے دور جا پڑی ہے۔

ظفر علی خان عمر بھر اپنے استاد کے مداح اور معترف دکھائی دیتے ہیں جہاں ممکن ہو وہ اپنے استاد کی تجلیل کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے وہ بزم اردو میں فلسفہ رسالت پر تقریر کرتے ہوئے معجزات اور دلائل نبوت کی بحث میں شبلی کی کتاب **الکلام** کو بے مثال قرار دیتے ہیں، ۲۴ آل انڈیا ریڈیو سے اقبال پر تقریر کرتے ہوئے اپنے استاد کا نظریہ شعر بیان کرتے ہیں ۲۵ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ استادِ گرامی کی پسندیدہ کتاب، **الفاروق** کے انگریزی ترجمے کی طرف متوجہ ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی کتابوں میں شبلی کو **الفاروق** سب سے زیادہ پسند تھی وہ اسے اپنی "مرصع غزل" کہتے تھے ۲۶ **سیرۃ النبی** کو چھوڑ کر شبلی نے جس کتاب کے لیے سب سے زیادہ محنت کی وہ یہی **الفاروق** تھی ۱۹۰۰ء میں ظفر علی خان نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا۔ کہا گیا ہے کہ یہ ترجمہ شمس العلما سید علی بلگرامی (۱۸۵۱ء ۔۔۔۔ ۱۸۷۴ء) کی فرمائش پر کیا گیا ۲۷ یہ بھی ممکن ہے کہ خود شبلی نے اپنے شاگرد سے اس ترجمے کی فرمائش کی ہو کیونکہ وہ اپنے پیغام کو زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچانا چاہتے تھے اور اپنے شاگرد کی صلاحیتوں سے بھی واقف تھے۔ افسوس کہ یہ ترجمہ مولانا شبلی کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا اور ان کی وفات کے بھی ایک طویل عرصے کے بعد ۱۹۳۹ء میں لاہور سے چھپ سکا اور ماضی قریب میں اس کی ایک نئی اشاعت بھی اسی ادارے سے سامنے آئی ہے جس نے اسے پہلی بار شائع کیا تھا ۲۸ اس ترجمے کے دیباچے میں ظفر علی خان اپنے استاد کا تعارف اس طرح کرواتے ہیں:

Prof Shibli (Shams-ul-Ulama) was a distinguished member of that enlightened group of Indian Muslims whose leader was the late Sir Syed Ahmad Khan, the founder of the Muhammadan Anglo Oriental College at Ali garh He is a profound scholar of Arabic and is thoroughly conversant with the annals of early Islam.۲۹

ادھر مولانا شبلی نے بھی اپنے عزیز شاگرد کی حوصلہ افزائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا حیدرآباد لانے سے لے کر ان کی حیدرآبادی ادبی زندگی تک میں ہمیں شبلی کی حوصلہ افزائی کارفرما دکھائی دیتی ہے۔ وہ دریا گنج کی قیامت صغریٰ پر ظفرعلی خان کی طویل نظم شور محشر پر انھیں داد دیتے ہیں۳۰ دکن ریویو میں قلمی تعاون کرتے ہیں اور جب معرکہ مذہب وسائنس شائع ہوتی ہے تو اسے ایسا ترجمہ قرار دیتے ہیں" جو مایوسی کی تاریکی میں امید کی جھلک پیدا کر دیتا ہے" شبلی رسالہ الندوہ میں اس پر مفصل ریویو کرتے ہوئے اپنے شاگرد کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں: "مترجم صاحب مشہور مترجم ہیں، ان کی کتاب خیابان فارس متداول ہو چکی ہے۔ دکن ریویو نے بھی ان کو کچھ کم روشناس نہیں کیا ہے۔ ترجمہ کی خوبی پر میں کچھ رائے نہیں دے سکتا، کیونکہ میں انگریزی نہیں جانتا، اس لیے ترجمہ کی صحت اور غلطی کا فیصلہ نہیں کر سکتا، البتہ اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ کسی علمی کتاب کا صحیح ترجمہ اس سے زیادہ صاف اور قریب الفہم نہیں ہو سکتا۔ مترجم نے مصطلحاتِ علمی کے ترجمہ میں بہت سے الفاظ گویا خود پیدا کیے ہیں۔ چنانچہ خاتمہ میں ایسے الفاظ کی فہرست دی ہے، اس میں بہت سے الفاظ ہم کو جدید النشاۃ نظر آتے ہیں مثلاً اسد کہفی، نباتات خوار، دور ثالثۃ الوسطی، دولاب تعدیل، توشیم، جماعت اکثرین، تقدیس الاموات وغیرہ وغیرہ۔"۳۱

ظفرعلی خان نے ترجمے میں اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جہاں کہیں انھیں مصنف کی آرا، خلاف انصاف نظر آئیں یا مصنف کی معلومات کے نقص سے انھیں قاری کی گمرہی کا اندیشہ ہوا انھوں نے حواشی میں اس کی تصحیح یا تصریح کر دی ان حواشی کے بارے میں شبلی نے لکھا: "مترجم کا یہ خاص احسان ہے کہ مصنف نے جہاں کوئی بات اسلام کے خلاف لکھی ہے انھوں نے نوٹ میں اچھی طرح اس کی پردہ دری کی ہے۔ اس وقت وہ مترجم نہیں بلکہ اچھے خاصے تند مزاج مولوی ہیں"۳۲ مترجم کے لیے یہ فخر ہی کیا کم تھا کہ جس سال استاد کی کتاب کو پنجاب یونی ورسٹی نے بہترین تصنیف کا انعام دیا اسی سال معرکہ مذہب و سائنس کو بہترین ترجمہ ہونے کا انعام ملا۳۳ اس پر استاد کی جانب سے ایسی تعریف وتوصیف بھی ملی۔ یہ حوصلہ افزائی اس کا دل بڑھانے کے لیے کافی تھی۔

سررشتہ علوم وفنون ریاست حیدرآباد دکن سے شبلی کی وابستگی مئی ۱۹۰۱ء سے جنوری ۱۹۰۵ء تک مجموعی طور پر تقریباً چار سال رہی اس کے بعد شبلی لکھنو آ کر ندوۃ العلما سے وابستہ ہو گئے۔ یہ اوائل ۱۹۰۵ء کی بات ہے۔ ندوے سے ان کی وابستگی جولائی ۱۹۱۳ء تک تقریباً آٹھ سال رہی اس دوران میں بھی لائق شاگرد سے ان کا رابطہ برقرار

رہا جس کا ثبوت ۱۹۱۲ء میں لکھے ہوئے اس خط سے ملتا ہے جس میں وہ انھیں ''عزیزی مولوی ظفر علی خان'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور ترکوں کے بارے میں اپنے فتوے کی تفصیل اور جواز سے آگاہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ شبلی کے نزدیک ترکوں کی حمایت و امداد اس وقت فرض عین ہو چکی ہے اور عید قربان کی قربانی پر، جو واجبات میں سے ہے، ترکوں کی امداد کا فرض عین فائق ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ظفر علی خان نے انھیں کوئی خط لکھا ہے یا شبلی تک ان کی کوئی تحریر پہنچی ہے جس میں عید قربان کی قربانی کو فائق قرار دیتے ہوئے اس سنت ابراہیمی کی ظاہری صورت پر اصرار کیا گیا ہے شبلی اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''آپ کہتے ہیں کہ سنت ابراہیمی موقوف نہ ہو یاں وہی سنت مقصود ہے فرق یہ ہے کہ آپ اس سنت کو لیتے ہیں جس کا مینڈھے پر عمل ہوا اور میں وہ پیش نظر رکھتا ہوں جو اسماعیل پر مقصود تھی'' اپنے اس موقف کو واضح کرنے کے بعد وہ مخاطب سے یہ سوال کرتے ہیں کہ ''کیا ترکوں کی جان مینڈھے سے بھی کم ہے'' اس سے شبلی کی ترکوں کے ساتھ غایت درجہ وابستگی اور محبت کا اظہار ہوتا ہے ترکوں اور خلافت کے ادارے سے جذباتی وابستگی میں ظفر علی خان بھی کسی سے کم نہ تھے انھوں نے خود ہندوستان سے ترکوں کے لیے چندہ جمع کیا اور یہ تحفہ خود ترکی جا کر سلطان کی خدمت میں پیش کیا جس سے ان کے جذبے کی شدت اور حرارت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی ترکوں کی محبت میں ظفر علی خان سے بھی آگے ہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ شاگرد کے دل میں بھی ترکوں سے محبت کی جوت استاد ہی نے جگائی ہو......؟ شبلی کی ترکوں سے محبت کا اظہار صرف اس خط ہی سے نہیں ہو رہا بلکہ ان کی شاعری میں بھی یہ محبت چھلکتی دکھائی دیتی ہے جیسا کہ انھوں نے اس خط میں بھی اپنی ایک نظم اقتباس کی ہے۔ اب لائق شاگرد کے نام استاد گرامی کا مکتوب ملاحظہ ہو:

عزیزی مولوی ظفر علی خان صاحب دام قدرہ السلام علیکم

میں نے جو فتویٰ لکھا اس سے علمائے فرنگی محل بھی متفق ہیں اور مولوی عبدالباری صاحب کا خط بھی شائع ہو چکا ہے ھدایہ میں اس کا جزئیہ موجود ہے البتہ ھدایہ میں صرف جواز ہے اور میں نے افضلیت کا فتویٰ دیا ہے اس قدر میرا اجتہاد ہے۔

بھائی! ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے اور قربانی کا درجہ واجب سے زیادہ نہیں آپ کہتے ہیں کہ سنت ابراہیمی موقوف نہ ہو پاں وہی سنت مقصود ہے فرق یہ ہے کہ آپ اس سنت کو لیتے ہیں جس کا مینڈھے پر عمل ہوا اور میں وہ پیش نظر رکھتا ہوں جو اسماعیل پر مقصود تھی کیا ترکوں کی جان مینڈھے سے بھی کم ہے یہاں کے جلسے میں میں نے چند شعر پڑھے تھے مناسبت موقع سے چند شعر [کذا] درج ہیں:

مراکش جا چکا، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک
بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی
چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک
حریفوں کو گلہ ہے آسماں سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں گے ان کی کھیتیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کا آشیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

شبلی لکھنؤ ۱۶ نومبر ۱۹۱۲ء ۳۴

یہ مکتوب ۱۹۱۲ء میں لکھا گیا۔ استادِ گرامی نے اپنے جو اشعار اس خط میں درج کیے وہ شہر آشوب اسلام کے تحت ''ہنگامہ طرابلس و بلقان'' کے زیرِ عنوان ان کی کلیات میں شامل ہیں۔ مولانا شبلی نے یہ نظم رفاہِ عام لکھنؤ کے جلسے میں پڑھی تھی، سید سلیمان ندوی کے بقول جب یہ نظم ''پڑھی گئی تو اس کا یہ اثر تھا کہ صدر سے لے کر پائین تک ماتم برپا ہو گیا تھا'' ۳۵ ان اشعار نے ظفر علی خان کو بھی متاثر کیا، اس کے آٹھ برس بعد خلافت کانفرنس برہان پور میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے انھیں اپنے استاد کی یہی نظم یاد آتی ہے اور وہ اس نظم کے اشعار سے اپنے خطاب کو مزین کرتے ہیں ۳۶ اسی پر بس نہیں استاد کے اس رنگ و آہنگ نے شاگرد کو اس قدر متاثر کیا کہ تین دہائیاں گزر جانے کے بعد بھی یہ آہنگ ان کے دردل پر دستک دیتا ہے اور وہ یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو بہ تبدیل قافیہ کہتے ہیں:

گجرومِ ملت بیضا سے پوچھا آج ہاتف نے — کہ چھوڑیں گے خداوندانِ مغرب اپنی خو کب تک

ملوکیت کے پیراہن کی رنگینی کو مشرق میں — رہے گی میرے خونِ ناروا کی جستجو کب تک

شراب خانہ ساز آئے گی کب بطحا کی بھٹی سے — رہیں گے فارغ اس کے دور سے جام و سبو کب تک

قبائے سلطنت قامت پہ کس دن راس آئے گی — کرے گا اسکو پاکستان کا درزی رفو کب تک ۳۷

شبلی کی شاعری سے ظفر علی خان کے شغف کا اظہار اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ وہ ان کے کلام کو انگریزی زبان میں منتقل کرتے ہیں۔ الفاروق کا انگریزی ترجمہ ان کی شبلی کی نثر اور تحقیق سے اثر پذیری کا مظہر ہے تو مسجد کان پور کے سانحے پر شبلی کی نظم کا مندرجہ ذیل ترجمہ ان کی شاعری سے اثر پذیری کا:

I saw some lifeless bodies yesterday,
All pierced through with gaping wounds were they.
And some were children silent as the tomb,
Their tender years reproached their tragic doom.
"We came to build the House of God on high,
But feeling drowsy slept, they seemed to sigh"
"And now we wait till Israfil shall sound,
His clarion which will bring senses round"
And some were young, even in the prime of life,
Versed in world's ways, skilled in stress and strife.
Their singing youth in tones of burning pride,
Confessed the guilt which weakness strove to chide.
Their haughty valour made their brawny breast,
A living shield for lance set in rest.

Their eager souls forestalled their ghostly fate,
Their right hands cut their throats, they scorned to wait.
And some were old men here not with rage and toil,
Who moved to shuffle off this mortal coil.
And as they rolled in dust and blood it seemed,
A halo round their beaming bodies gleamed.
I said "who are you" and could say no more,
A voice replied, "The victims of cawnpore" ۳۸

باہمی تعلق کے کچھ اور مظاہر بھی ایسے ہیں جن سے ظفر علی خان اور مولانا شبلی کے ربط و تعلق کی وسعتیں معلوم ہوتی ہیں مثلاً وہ مئی ۱۹۰۱ء میں حیدر آباد آئے تھے یہاں کا قیام خاصا خوش گوار رہا تھا لیکن جیسا کہ ریاستوں اور خود مختار اداروں میں ہوتا ہے حالات بدلتے دیر نہیں لگتی ۱۹۰۴ء میں صورت حال نے پلٹا کھایا وہ لوگ جو آغاز ہی سے سر رشتہ، علوم و فنون کو "فضول سمجھتے" تھے غالب آ گئے ۳۹ اور یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ مولانا شبلی جس شعبے میں کام کر رہے ہیں اس کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟ چنانچہ اس کی تحقیق کے لیے ایک کمیشن بٹھا دیا گیا جس نے رپورٹ دی کہ اس صیغے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے اگرچہ ریاست کے مدار المہام مولانا کے وہیں رہنے کے حق میں تھے لیکن مولانا بد دل ہو چکے تھے اب ان کے سامنے دو راستے تھے وہ واپس علی گڑھ چلے جائیں یا ندوۃ العلما جائیں شبلی کو دونوں اداروں سے تعلقِ خاطر تھا۔ ندوہ جانا سراسر قربانی اور ایثار کا تقاضا کرتا تھا، انھی دنوں انھوں نے لکھنو سے نکلنے والے اخبار ہندوستانی میں جس کے مدیر گنگا پرشاد ورما تھے، ایک ہندو انجمن کی تاسیس اور ہندوؤں میں قومی ایثار کے جذبے کا پڑھا تو ان کی اثر پذیر طبیعت بہت متاثر ہوئی اور انھوں نے ندوہ جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن یوں کہ وہ علی گڑھ اور ندوہ دونو کو وقت دیتے رہیں گے ۴۰ مولوی بشیر الدین ایڈیٹر البشیر اٹاوہ کے نام ایک خط کا دیکھنا اس سلسلے میں صورت حال کی وضاحت کرتا ہے جس میں ظفر علی خان کا بھی ذکر ہے:

> مکرمی! اصل یہ ہے کہ میں اخبار ہندوستانی میں اکثر ہندوؤں کے ایثار نفس کے واقعات پڑھا کرتا تھا اور ہر دفعہ مجھ کو نیا جوش پیدا ہوتا تھا یہاں تک کہ ایک دفعہ ہندوستانی کا پرچہ دیکھ کر اس قدر اثر ہوا کہ اسی وقت میں نے ظفر علی خان کو بھیجا کہ عماد جنگ سے کہو کہ میرا منصب جو رک گیا تھا، جاری کرا دیں تو میں فوراً استعفیٰ دے کر چلا جاؤں لیکن عماد جنگ کچھ نہ کر سکے بالآخر میں نے دلیری کر کے استعفیٰ دے دیا اور چلا آیا منصب پھر جاری ہو گیا ارادہ بھی یہی تھا اور ہے کہ علی گڑھ اور لکھنو دونو جگہ بہ حصہ مساوی قیام کروں لیکن لکھنو آ کر دیکھا تو موجودہ ناظم کی کج روی نے ندوہ کو جاں بلب کر دیا ہے دیکھا نہ گیا۔ کوشش کر کے ان کو نظارت سے ہٹایا اور دار العلوم کو ہاتھ میں لیا۔ چونکہ تمام امور درہم برہم ہیں دو تین مہینے مستقل قیام کرنا پڑے گا تا کہ انتظام کے پرزے کام دینے لگیں۔ امید ہے کہ جب ایک ڈھچر قائم ہو جائے تو علی گڑھ

جانے اور رہنے کا موقع ملے یہاں کے طلبا میں جو روشن خیالی اور قابلیت علمی ہے بغیر مدارس عربیہ میں اس کا پرتو تک نہیں۔ کسی قوی کام پر اپنے آپ کو وقف کرنا بڑا کام ہے۔ میرا منہ نہیں کہ میں یہ دعویٰ کروں، اس لیے میں نے اپنے منہ سے یہ حرف نہیں نکالا البتہ طریق عمل سے لوگوں نے قیاس کیا اور شہرت دی۔ ہاں انجمن کا کام جاری رہے بابو صاحب کو کہیے کہ کتابیں بھیج دیں۔ ندوہ کی ہمدردی پر بعض حامیان کالج مجھ کو رقیبانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن میں اس کو کیا کروں میرے نزدیک ندوہ کے مقاصد کالج کو قوت دینے والے ہیں۔''؎۳۱

بعض اشاروں سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ندوے جانا شبلی کی دیرینہ خواہش بھی تھی ریاست کے مذکورہ حالات نے اس خواہش کے لیے راہ ہموار کردی مثلاً ۱۸؍اکتوبر ۱۹۰۳ء کو مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں سال بھر سے اس کوشش میں مصروف تھا کہ وظیفہ (حیدر آباد) جاری ہو جائے تو سال بھر کی رخصت لے کر ندوہ میں آؤں اور پھر ترک ملازمت کردوں لیکن دو ہفتے ہوئے نتیجہ اخیر ناکامی ہوئی اب جو کچھ ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ چھ مہینے کی رخصت لوں اور ندوہ میں آؤں۔ رخصت میں تنخواہ نہ ملے گی شاید ابتدائی مہینوں کی ملے اس وقت رخصت لینا اس لیے بیکار ہے کہ مہینہ بھر کے بعد رمضان کی تعطیل ہو جائے گی اس کے سوا ندوے اور کانفرنس کے لیے پھر ادھر آنا پڑے گا......''شبلی ۱۸؍اکتوبر ۱۹۰۳ء ؎۳۲

آخر حیدر آباد چھوڑتے ہی بنی اور وہ اوائل ۱۹۰۵ء میں سررشتہ علوم وفنون سے مستعفی ہو کر لکھنؤ چلے گئے۔ ہر چند نواب محسن الملک نے علی گڑھ اور بیگم صاحبہ بھوپال نے بھوپال آنے کی دعوت دی لیکن شبلی نے کہیں اور جانا پسند نہ کیا ؎۳۳

﴿۲﴾

نشیب وفراز انسانی تعلقات کا خاصہ ہیں کوئی بھی رابطہ ہوسدا ایک ہی رنگ پر قائم نہیں رہتا۔ مزاجوں کا اختلاف اس میں نشیب وفراز کی کیفیت پیدا کر ہی دیتا ہے شبلی اور ظفر علی خان کے باہمی ربط ضبط میں بھی بعض اوقات وراڑ پیدا ہوئی اس کا سبب ظفر علی خان کی تلون مزاجی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ ظفر علی خان کی طبیعت میں منصوبہ سازی کا عنصر بہت تھا۔ وہ منصوبے بہت تیزی سے بناتے اور جلد فراموش بھی کر دیتے۔ شبلی کے خطوط میں ظفر علی خان کے تلون کا شکوہ ہے۔ ۳۰؍مارچ ۱۹۰۸ء کو مولوی سید ممتاز علی کے نام لکھے جانے والے خط میں وہ کسی ایسے منصوبے کا تذکرہ کرتے ہیں جس میں ظفر علی خان کے سپرد ایک کتاب کا ترجمہ کیا گیا تھا اور اس کے لیے جو مدت مقرر کی گئی تھی وہ گزر جانے کے باوجود یہ ترجمہ تیار نہیں ہوسکا۔ یہ ترجمہ چونکہ شبلی کی تجویز پر کیا جانا تھا اور یہ بات متعلقہ انجمن کی رپورٹ میں بھی آچکی تھی اس لیے شبلی نے اس منصوبے کی ناکامی پر پریشان ہو کر لکھا:

''مسٹر ظفر کی وجہ سے بڑا دھوکا ہوا انھوں نے کتاب کے اسی قدر اجزا ترجمہ کیے تھے کہ اور کاموں میں مصروف ہو گئے وہ نہایت متلون الطبع آدمی ہیں مجھ کو سخت افسوس ہے کہ رپورٹ

میں اس کا تذکرہ ہو چکا ہے لوگ مجھ کو کیا کہیں گے؟ انھوں نے اپنا ذاتی مطبع بھی قائم کر لیا ہے ایک دن کہتے تھے کہ میں اپنے ہی مطبع میں چھپواؤں گا لیکن یہ بھی ایک بات ہے کتاب تیار ہی نہیں اور نہ ایک مدت تک امید ہے"۔..... شبلی ۳۰/ مارچ ۱۹۰۸ء ۴۴

یہاں صورت حال خاصی سنجیدہ ہو گئی ہے۔ منصوبے کو قبول کر لینا اور بروقت مکمل نہ کرنا پریشان کن ہو سکتا ہے اور مولانا شبلی کو کچھ ایسی ہی صورت حال پیش آئی ہے۔ ظفر علی خاں کی سیرت چند جملوں میں بیان کرنا ہو تو یہ قول چراغ حسن حسرت ہے کہا جاسکتا ہے کہ "وہ ہاتھ کے سخی، دل کے نرم، کان کے کچے اور دھن کے پکے تھے، ان کی آرزو تھی کہ دنیا کے سارے کام ان کے ہاتھوں انجام پا جائیں لیکن ایک سر ہزار سودا بیچارے کیا کیا کرتے۔

غم عالم فراوان است و من یک غنچہ دل دارم

چسان در شیشہ ساعت کنم ریگ بیابان را ۴۵

پھر حالات ناموافق، سرو سامان ناپید، وقت ساتھ نہیں دیتا اور رفقا، ہمرہان سست عناصر دو قدم ساتھ نہیں چل سکتے، مسئلہ فلسطین کی گتھی کون سلجھائے.....؟ مسلمانوں کی تجارت کا انتظام کون کرے.....؟ مسجدوں کی تنظیم کے لیے کہاں سے کارکن آئیں.....؟ مسلم لیگ کی شاخیں کون کھولے.....؟ تحریک اتحاد ملت تو چل رہی ہے لیکن اس تحریک کو سارے ہندوستان میں پھیلانا ہے، تبلیغ کا کام بھی تھوڑا بہت ہوتے رہنا چاہیے اور ان جھگڑوں میں اُردو کی خدمت تو رہ گئی اُردو میں کام کی کتابیں انگلیوں پر گننے کے لائق ہیں، یورپی زبانوں کی ساری قابل ذکر کتابوں کا ترجمہ اردو میں ہو جانا چاہیے" ۴۶ ..... یہ تھا مولانا ظفر علی خان کا مزاج اور احوال جس میں استاد گرامی کو شکوہ پیدا ہوا کہ انھوں نے منصوبے کے مطابق ترجمہ مکمل کر کے نہیں دیا اور استاد کو خفت اٹھانی پڑی۔

بہ ظاہر اس کتاب کا سراغ لگانا، جس کے ترجمے کا یہ ذکر ہے، دشوار ہے۔ جستجو کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰۳ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی میں انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا تھا، اس کے صدر پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ اور سیکریٹری مولانا شبلی نعمانی مقرر ہوئے تھے۔ مولانا شبلی کو اردو کا دامن وسیع کرنے کے لیے تراجم کا بہت خیال رہتا تھا ان کے خطوط سے اس دل چسپی کا حال معلوم ہوتا ہے وہ ہر صاحب علم سے ترجمے کی خواہش کرتے تھے اس طرح انھوں نے بہت سے اصحاب سے ترجمے کرا کر اردو کا دامن وسیع کیا۔ انجمن ترقی اردو میں بھی ترقی اردو کے لیے ان کا پہلا ہدف غیر زبانوں کی علمی کتابوں کے اردو میں تراجم تھا چنانچہ انھوں نے اس انجمن کے سیکریٹری کی حیثیت سے چودہ کتابوں کے تراجم کا پروگرام بنایا جن میں دوسرے نمبر پر Conflict Between Religion and Science کا نام ملتا ہے ان تراجم کی جانچ کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی جس میں پروفیسر آرنلڈ، علامہ اقبال اور ڈپٹی نذیر احمد بھی شامل تھے ۴۷

ظفر علی خان کے اس زمانے کے دیگر تراجم پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سیر ظلمات ۱۹۰۰ء میں جنگل میں منگل ۱۹۰۱ء میں خیابان فارس ۱۹۰۲ء میں چھپ چکی تھیں، جنگ روس و جاپان، بھی پہلی بار ۱۹۰۵ء میں چھپ چکی تھی۔ ۴۸ ظفر علی خان کے کیے ہوئے تراجم میں شبلی کی نشان زدہ کتاب کا ترجمہ بھی شامل

ہے جو معرکہ مذہب وسائنس کے نام سے شائع ہوا اور جس پر جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہوا، مولانا شبلی نے ایک مفصل تبصرہ لکھا جو رسالہ الندوہ میں شائع ہوا۔ لیکن الجھن یہ ہے کہ معرکہ مذہب و سائنس کے انتساب میں ظفرعلی خان نے لکھا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ نواب محسن الملک کی تحریک پر پندرہ سال پہلے کیا تھا جو اب نظرثانی کے بعد حواشی کے ساتھ مکمل ہو کر شائع ہو رہا ہے۔ یہ انتساب ۱۹۱۰ء کا ہے اس کا مطلب ہے ترجمہ ۱۸۹۵ء میں کیا گیا تھا.....؟ پھر ۱۹۰۸ء میں شبلی ترجمے کی ناتمامی کا شکوہ کیوں کر رہے ہیں؟ اس الجھن کو سلجھانے کی ایک ہی صورت ہے کہ یہ مانا جائے کہ ظفرعلی خان نے ترجمے کا آغاز ۱۸۹۵ء میں کر دیا ہوگا البتہ اس کی تکمیل ۱۹۱۰ء میں جا کر ہوئی جیسا کہ انتساب کی عبارت میں نظرثانی اور حواشی کے کام کا بعد میں انجام پانا معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے اس قیاس کی تصدیق مصنف کے حالات کے آخر میں درج مترجم کے نام کے نیچے دی ہوئی تاریخ سے بھی ہو رہی ہے جو "کرم آباد ۵/مارچ ۱۹۱۰ء" ہے... واللہ اعلم بالصواب... اس کا مطلب ہے کہ شبلی کی فرمائش پر ظفرعلی خان نے اپنے پہلے سے جاری منصوبے کو ان کے اشاعتی پروگرام سے منسلک کر دیا لیکن اندازے کے مطابق یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ شبلی کا شکایتی خط ۳۰/مارچ ۱۹۰۸ء کا ہے معرکہ مذہب وسائنس ۱۹۱۰ء میں انجمن اردو حیدرآباد دکن نے رفاہ عام سٹیم پریس لاہور سے شائع کی۔ اس کا مطلب ہے دو برس بعد ہی سہی ظفرعلی خان نے اپنا کام بالآخر پورا کر دیا تھا۔ جہاں تک ظفرعلی خان کے اس بیان کا تعلق ہے کہ انھوں نے اپنا مطبع بھی قائم کر لیا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کتاب کو اپنے ہی مطبع میں چھپوا دوں کا تو اس کا امکان ہے کہ وہ حیدرآباد کی خوش حالی کے زمانے میں اپنا مطبع قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے ہوں جیسا کہ دکن ریویو کے طابع کے طور پر چھپنے والے "مطبع اختر دکن حیدرآباد دکن" کے الفاظ اس کی تائید کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان کے فرزند کا نام اخترعلی خان تھا۔ اگر ظفرعلی خان کے تمام منصوبوں کی جستجو کی جائے تو البتہ سکاٹ کی تاریخ اندلس کا سراغ ملتا ہے جس کے بارے میں چراغ حسن حسرت نے لکھا ہے کہ" سکاٹ کی تاریخ اندلس کا ترجمہ بھی شروع کیا تھا، جو ادھورا ہی رہ گیا"۔[۴۹]

ظفرعلی خان کے بارے میں شبلی کی رائے کے اس رخ کا سراغ ان کے ایک اور خط میں بھی ملتا ہے۔ یہ خط بمبئی سے ۲۰/اگست ۱۹۱۳ء کو مولانا حمیدالدین فراہی کے نام لکھا گیا۔ مولانا حمیدالدین فراہی شبلی کے عزیز اور شاگرد تھے بلکہ عزیز تر شاگرد تھے جن کے علم وفضل پر شبلی غیرمعمولی اعتماد کرتے تھے، اس خط میں بھی ان کے ساتھ کچھ علمی مسائل زیربحث ہیں ان کے ساتھ شبلی لائق شاگرد کو اپنی سرگرمیوں اور تازہ ترین مصروفیات سے بھی آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "انصاری وفد جو قسطنطنیہ سے واپس آیا اس پر میں نے ایک نظم لکھی تھی شاید تم نے دیکھی ہو زمیندار اردو کیل میں چھپی تھی، جلسہ میں تمام لوگ بے اختیار روتے تھے مجھ پر خود بھی رقت طاری تھی۔ ظفرعلی ملے تھے وہ تو بڑی امیدیں دلاتے ہیں لیکن وہ غیرمعتدل جوش اور خوش اعتقادی ہیں ان کا اصرار ہے کہ تم اور حمید مدینہ یونی ورسٹی کے لیے چلے جاؤ ان کا خیال ہے کہ خود وہاں

سے طلبی ہوگی......" [۵۰]

یہ وہ زمانہ ہے جب جنگ بلقان کے سبب سے سارا ہندوستان ترکوں کی محبت سے معمور تھا مسلمانان ہند کی جانب سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں ایک طبی وفد ترکی بھیجا گیا تھا جس نے ترک بھائیوں کو ہندی مسلمانوں کی محبت کا عملی پیغام پہنچایا تھا ادھر ظفر علی خان اور ان کے اخبار زمیندار نے مسلمانان ہند کو خبر رسانی کے جدید ترین ذرائع اختیار کر کے جنگ کی تازہ ترین صورت حال سے باخبر رکھا تھا اور خود بھی چندہ جمع کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کرنے ترکی گئے تھے اور انھی دنوں واپسی ہوئی تھی۔ شبلی جس جلسے میں نظم سنانے کا ذکر کر رہے ہیں وہ ڈاکٹر انصاری کے وفد کی واپسی پر ان کے اعزاز میں منعقد کیا گیا تھا ...... یہاں شبلی کی شخصیت اور ان کے قومی جذبات کا اندازہ لگانے کے لیے اس منظر کو دیکھنا چاہیے جس میں بوڑھے علامہ شبلی نعمانی، گاڑی کے دروازے پر کھڑے ترکی جاتے ہوئے جوان ڈاکٹر انصاری کے قدموں میں جھک کر ان کا بوسہ لیتے اور انھیں اپنے اشکوں سے دھوتے دکھائی دیتے ہیں ...... واپسی پر جب ڈاکٹر انصاری نے مولانا کو اپنے قدموں کا بوسہ لینے سے روک دیا تو مولانا نے فرمایا کہ "یہ تمھارے پاؤں نہیں اسلام کے مجسمہ غربت کے پاؤں ہیں" [۵۱] مولانا شبلی کے یہی جذبات محبت و عقیدت تھے جو اس جلسے میں شعروں کی صورت ظاہر ہوئے جو انصاری وفد کی واپسی پر اس کے استقبال کے لیے بمبئی میں منعقد کیا گیا تھا نظم کے دو بند ہیں دوسرا بند بہ قول شخصے "قیامت کا ہے، ناممکن ہے کہ آج بھی وہ پڑھا جائے اور سننے والے کا دل اثر سے نہ بھر جائے" [۵۲] ...... نظم کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے:

جنون جوش اسلامی کو کی سمجھا تو تم سمجھے　　　کہ تم نے لیلی اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے　　　کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں
دعائے کہنہ سالاں ہے اگر مقبول یزدانی　　　تو اب دستِ دعا ہے اور یہ شبلی نعمانی

نظم طویل ہے پوری نظم کلیات شبلی اور حیات شبلی میں دیکھی جا سکتی ہے [۵۳] ۔

اب آتے ہیں شبلی کے مکتوب میں مذکور دوسری بات کی طرف: ظفر علی خان کی رجائیت اور ان کی امیدیں جنگ کے بعد ترکی خلافت کے احیا کی بھی ہو سکتی ہیں اور شبلی کے مستقبل کے حوالے سے بھی .... جنگ بلقان کے نتائج میں ایک یہ احساس بھی تھا کہ مدینہ منورہ میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں تمام عالم اسلام سے طالب علم جمع ہوں اور عالم اسلام کے قابل ترین دماغ ان کی تعلیم و تربیت کریں مولانا شبلی نے اس یونی ورسٹی کے نظام اور نصاب تعلیم کے سلسلے میں مفصل تجاویز لکھ کر شائع کی تھیں [۵۴] اس تجویز کے حوالے سے ظفر علی خان نے شبلی سے جو کہا اس سے ان کے نیک جذبات اور تمناؤں کا اظہار ہوتا ہے۔ شبلی اپنے ایک دوسرے خط میں اس رائے کی نسبت لکھتے ہیں کہ "افسوس ہے کہ اب ہمت نہیں کہ اس کے متعلق کچھ کر سکوں پہلی سی بات ہوتی تو مدینہ جانا کیا مشکل تھا" [۵۵] بہ ہر حال اس مکتوب سے یہ واضح ہے کہ ظفر علی خان اپنے استاد گرامی مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی کی قابلیت کے حوالے سے کیسی بلند رائے رکھتے تھے کہ ان کے خیال میں ان دونو اصحاب

کے علم وفضل کے اظہار کے لیے مدینہ یونی ورسٹی بہتر پلیٹ فارم ہوسکتا تھا، باقی رہا اس پر شبلی کا تبصرہ تو اس پر کسی حد تک پہلے بات ہو چکی ہے البتہ شبلی کے جملے میں جو جھول پایا جاتا ہے اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ مجموعہ مکاتیب کے جامع سے نقل میں کچھ تسامح ہوا ہے ورنہ "وہ غیر معتدل جوش اور خوش اعتقادی ہیں" کی جگہ۔۔۔ غیر معتدل جوش اور خوش اعتقادی کے حامل ہیں ہونا چاہیے تھا۔

یہ شبلی کی زندگی کا آخری بھر پور سال ہے اس سے اگلے برس ۱۹۱۴ء میں وہ راہیِ ملک عدم ہو گئے۔ افسوس کہ اس زمانے کے زمیندار کے فائل محفوظ نہیں ورنہ اس زمانے کے اخبارات ان مباحث پر واضح روشنی ڈال سکتے تھے۔۔۔ قدیم لائبریریوں میں زمیندار کا ریکارڈ موجود نہیں۔ لاہور میوزیم کی لائبریری میں جو کٹے پھٹے شمارے ہیں ان میں ۱۹۲۰ء سے پہلے کا کوئی شمارہ نہیں ہے۔ زمیندار کے اداریوں کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے اس کا آغاز جنوری ۱۹۲۳ء سے ہوتا ہے ۵۶ اندریں حالات ہم دستیاب ماخذ ہی پر اکتفا کرنے پر مجبور ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

شبلی کے بارے میں ظفر علی خان کی ایک تحریر کا حوالہ تو سطور بالا میں دیا جا چکا ہے شبلی پر ظفر علی خان کے نام سے ایک اور تحریر "آفتاب علم غروب ہو گیا" کریسنٹ لاہور کے شبلی نمبر میں شائع ہوئی تھی جو دراصل شبلی کی وفات پر شائع ہونے والا تعزیتی اداریہ تھا۔ حال ہی میں اس اداریے کی ۲۳ اور ۲۴ نومبر ۱۹۱۴ء کی دونو اقساط سامنے آئی ہیں جن کے ساتھ یہ صراحت بھی کی گئی ہے کہ یہ تحریر مولانا ظفر علی خان کی نہیں بلکہ زمیندار کے ایک زمانے کے ایڈیٹر مولانا عبداللہ عمادی کی ہے ۵۷۔

شبلی کی رائے میں "علی گڑھ کو محمد علی کی ذہانت اور ظفر علی خان کی جرات پر ہمیشہ ناز رہے گا" وہ اپنے اس لائق شاگرد کے کمالات کے کس قدر مداح تھے اس کا اندازہ ان کی اس رائے سے بھی کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے ظفر علی خان کے بارے میں دی انھوں نے کہا کہ: "ظفر علی خان کا نام اور کام محو ہونے کی چیز نہیں ہمارے چل چلاؤ کا زمانہ ہے لیکن ایک گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے کی باگ ڈور نوجوانوں نے سنبھال رکھی ہے" ۵۸ شبلی کی توجہ کا مرکز دراصل یہی نوجوان تھے جن سے انھیں مستقبل میں جو توقعات وابستہ تھیں انھوں نے علی گڑھ میں اپنے آخری خطاب میں بھی انھی نوجوانوں کو مخاطب کیا تھا شبلی کا علی گڑھ میں آخری خطاب بھی خاصے کی چیز ہے انھوں نے بڑے جوش سے طلبائے دارالعلوم کو مخاطب بنا کے فرمایا تھا:

کیسے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے
یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہد شباب اپنا
اور اب تو جو کچھ ہے جو کچھ امیدیں ہیں وہ تم سے ہیں
جواں تم ہو لب بام آ چکا ہے آفتاب اپنا ۵۹

حقیقت یہ ہے کہ ظفر علی خان اپنے استاد کی امیدوں اور توقعات پر پورے اترے اور انھوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ قومی خدمت کی وہی راہ اختیار کی جس کے لیے ان کے والد نے ان کی تربیت کی تھی اور شبلی نے

انھیں جس کے لیے تیار کیا تھا۔ ظفر علی خان شہرت و مقبولیت کے ہفت آسماں تک پہنچے لیکن اس کے باوصف انھوں نے اپنی شخصیت کی تشکیل و تکمیل میں اپنے بلند رتبہ استاد کی خدمت کا اعتراف کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور برملا کہا ـ

یہ فیضِ صحبتِ علامۂ شبلی کا صدقہ ہے
کہ دنیائے ادب میں دھوم ہے میرے مقالوں کی [۶۰]

حوالے اور حواشی:

۱ علی گڑھ کے دور طالب علمی میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر سر ضیاء الدین اور مولانا حمید الدین فراہی مولانا ظفر علی خان کے معاصرین تھے اس بات کی تصدیق رپورٹ ترقی تعلیم مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ بابت سال ۹۶-۱۸۹۵ء مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۶ء تتمہ ضمیمہ نمبر ۴ ص ۴۴ سے بھی ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ طالب علم فورتھ ایر میں حاجی اسماعیل خان لائل اسکالرشپ لیا کرتے تھے۔
ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی ذکر فراہی لاہور: دار التذکیر ۲۰۰۲ء ص ۱۵۵

۲ محمد حمزہ فاروقی "مولانا شبلی اور سید سلیمان ندوی کا اشتراک علمی" در بنیاد زیر ادارت تحسین عارف لاہور: یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (لمز) ۲۰۱۴ء جلد ۵ ص ۲۱۸

۳ سید سلیمان ندوی مکاتیب شبلی اعظم گڑھ: دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، یوپی طبع جدید ۲۰۱۰ء جلد اول ص ۳۴۸

۴ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی مکتوبات شبلی اعظم گڑھ: ادبی دائرہ ۲۰۱۲ء ص ۶۴

۵ شبلی کی مدح میں ظفر علی خان کا شعر ملاحظہ ہو:
خداوند کریمت لحن داؤدی عطا کردہ
کنی تسخیر دلہا چوں کنی تفسیر قرآنی
پورا قصیدہ زیر نظر مضمون میں شامل ہے

۶ مطبوعہ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۶ فروری ۱۹۳۸ء اس مقام پر ظفر علی خان نے اپنی نظم "سخنوران عہد سے خطاب" کے اشعار درج کیے ہیں۔ نظم سخنوران عہد سے خطاب، سرودہ ۱۴ فروری ۱۹۲۹ء کے لیے دیکھیے: بہارستان، لاہور: مکتبہ کارواں س۔ن ص ۴۷۵

۷ ڈاکٹر سید معراج نیر بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ فن اور شخصیت لاہور: ادارہ ابلاغ ۱۹۹۵ء ص ۲۸

۸ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام یادگار شبلی لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ ۱۹۷۱ء ص ۲۳۰

۹ اثر کے پیچھے دلِ حزیں نے سراغ چھوڑا نہیں کہیں کا

گئے ہیں نالے جو سوئے گردوں تو اشک نے رخ کیا زمیں کا
وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں وہ اگلی ہی سی شرارتیں ہیں
سیانے ہوں گے تو ہاں بھی ہوگی ابھی تو سن ہے نہیں نہیں کا
یہ نظم آئیں، یہ طرز بندش سخن وری کیا فسوں گری ہے
کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرز علی حزیں کا

شبلی نعمانی کلیات شبلی اردو اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی طبع جدید ۲۰۰۷ء ص ۱۳

۱۰ شاعر کے نام کے طور پر بجائے ظفرعلی خان کے ''نقاش'' لکھ دینا زیادہ مناسب سمجھا گیا۔

بڑھا ہے آگے کو روز روشن ہٹی ہے پیچھے کو رات کالی
بچھڑ گیا آسماں کا میلہ ہوئی ستاروں سے بزم خالی

دکن ریویو سلسلہ جدید اسلام نمبر سلک دوم ستمبر و اکتوبر جلد اول شمارہ ۱۱، ۱۲ ۱۹۰۷ء ص ۸۹ یہ غزل اب خیالستان میں شامل ہے طبع جدید لاہور: ظفرعلی خان ٹرسٹ ۲۰۱۳ء ص ۱۰۳

۱۱ سید سلیمان ندوی حیات شبلی یعنی شمس العلما علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات اور علمی کارنامے اعظم گڑھ: دارالمصنفین اعظم گڑھ یوپی طبع جدید ۲۰۰۸ ص ۲۱۴

۱۲ *History of the Conflict between Religion and Science* by; John William Draper M.D,LL.D Late Professor in the University of New York and author of 'A treatise on human psychology' London 1885

۱۳ ظفرعلی خان (مترجم) معرکہ مذہب و سائنس لاہور: الفیصل ناشران ۱۹۹۵ء ص ۵

۱۴ ظفرعلی خان ازالۃ الخفا دوسری قسط روزنامہ زمیندار لاہور ۲۳ راپریل ۱۹۲۸ء

۱۵ ظفرعلی خان در پنجاب ریویو جلد ۱ شمارہ ۲ صفحہ ۳۷ بحوالہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ظفرعلی خان ادیب و شاعر لاہور: مکتبہ خیابان ادب ۱۹۶۷ء ص ۷۳

۱۶ عبدالحق چند ہم عصر کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان ۲۰۱۰ء ص ۷۹

۱۷ مثال کے طور پر شبلی کا مقالہ ''تزک جہانگیری اور جہانگیر'' جنوری فروری اور مارچ ۱۹۰۴ء کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا، جنوری ۱۹۰۴ء کے شمارے میں ان کی نظم ''دکن'' شائع ہوئی جون جولائی ۱۹۰۴ء کے شمارے میں ایک بلاعنوان نظم شائع ہوئی۔ نومبر ۱۹۰۷ء دسمبر ۱۹۰۷ء فروری ۱۹۰۸ء کے شماروں میں بھی شبلی کی غزلیں شائع ہوئیں وقس علی ھذا۔ ....

۱۸ اظہار تشکر میں پہلے تین نام مہاراجہ کشن پرشاد شاد، مولوی عزیز مرزا اور اکبر الہ آبادی کے ہیں۔ ''التماس'' از ایڈیٹر دکن ریویو سلسلہ جدید ستمبر اکتوبر ۱۹۰۷ء جلد اول نمبر ۱۱۔۱۲ اسلام نمبر سلک دوم صفحہ ''د''

۱۹ ظفرعلی خان اڈیٹوریل (بہ سلسلہ موازنہ انیس و دبیر اور ردّ الموازنہ) دکن ریویو اگست ۱۹۰۸ء صفحہ ج تا ح در شبلی معاصرین کی نظر میں مرتبہ: ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی لکھنو: اترپردیش اردو اکادمی ۲۰۰۵ء ۲۶۷

۲۰ ایضاً ص ۲۶۸

۲۱ ایضاً ص ۲۷۱

۲۲ دیکھیے ہماری کتاب مکاتیب ظفرعلی خان لاہور: سنی پبلی کیشنز ۱۹۸۶ء صص ۶۳ تا ۷۰

۲۳ مکتوب بابائے اُردو بنام عبداللطیف اعظمی در شبلی نقادوں کی نظر میں مرتبہ محمد واصل عثمانی کراچی: صفیہ اکیڈمی ۱۹۶۷ء ص ۱۱۹۔۱۲۰

۲۴ پیسہ اخبار یکم دسمبر ۱۹۰۹ء بحوالہ احمد سعید (مرتب) گفتار ظفرعلی خان ،لاہور: ظفرعلی خان ٹرسٹ ۲۰۱۵ء ص ۸

۲۵ پندرہ روزہ نوائے وقت لاہور ۲۷ ستمبر ۱۹۴۰ء بحوالہ پروفیسر احمد سعید (مرتب) اقبالیات نوائے وقت (۱۹۴۰ء تا مارچ ۱۹۴۷ء) لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۲۰۱۵ء ص ۶۳

۲۶ یادگارِ شبلی ص ۲۰۴

۲۷ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار مولانا ظفرعلی خان حیات ،خدمات و آثار لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء ص ۳۹

۲۸ شیخ محمد اشرف پبلشرز لاہور

۲۹ Zafar Ali Khan (Translator) ***Al-Farooq Life of Umar the Great*** by Shams-ul-Ulama Allama Shibli Numani Lahore:ShMuhammad Ashraf Publishers 2006 P XVII

۳۰ مولانا ظفرعلی خان حیات ،خدمات و آثار ص ۵۱۵

۳۱ شبلی نعمانی معرکہ مذہب و سائنس مصنفہ ڈریپر مترجمہ مسٹر ظفرعلی خان بی اے پر ریویو الندوہ جلد نمبر ۷ شمارہ ۸ شعبان المعظم ۱۳۲۸ھ در مقالاتِ شبلی" (تنقیدی) جلد چہارم مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی" ،اعظم گڑھ: مطبع معارف ۱۹۵۶ء ص ۱۷۸۔۱۸۸

۳۲ ایضاً

۳۳ بہار پراونشل اردو کانفرنس پٹنہ میں ۲۳ ستمبر ۱۹۲۵ء کو اپنے خطبہ صدارت کے دوران میں مولانا ظفرعلی خان نے کہا:

"اس دور کا آخری سال وہ تھا جب علامہ شبلی مرحوم نے شعرالعجم تصنیف کی اور میں نے ڈاکٹر ولیم جان ڈریپر کی کتاب "کانفلکٹ بیٹوین ریلیجن اینڈ سائنس" کا اردو ترجمہ معرکہ مذہب و سائنس کے نام سے پایہ اتمام کو پہنچایا پنجاب یونی ورسٹی کا دستور تھا کہ وہ ہر سال اردو کی بہترین تصنیف پر مصنف کو اور بہترین ترجمے پر مترجم کو نقد انعام دیا کرتی تھی چنانچہ مولانا شبلی مرحوم کو شعرالعجم کے تصنیف کرنے پر پندرہ سو روپیہ اور مجھے معرکہ مذہب و سائنس پر پانچ صد روپیہ نقد انعام ملا۔اس کے بعد اس سلسلے میں یہ ترمیم ہوئی کہ اب یہ انعام باری باری سے بٹتا ہے یعنی ایک سال گورمکھی کے مصنف یا مترجم کو دیا جاتا ہے دوسرے سال ہندی کے مترجم یا مصنف کو اردو کی باری تیسرے سال آتی ہے ۔زبان کی ترقی و ترویج کے لیے سرکاری طور پر کسی صلے انعام یا عطیہ کا

دیا جانا از حد ضروری ہے۔ افسوس ہے کہ پنجاب یونی ورسٹی نے دشمنان اردو کی معاندانہ کوششوں سے متاثر ہو کر اس سے بڑی حد تک ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ .... '' زمیندار ۲/ اکتوبر ۱۹۲۵ء بحوالہ گفتار ظفر علی خان ص ۳۱۸

۳۴۔ مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۳۲۸۔۳۲۹

۳۵۔ سید سلیمان ندوی (مرتب) کلیات شبلی اردو، شبلی نعمانی، اعظم گڑھ: دار المصنفین شبلی اکیڈمی طبع جدید ۲۰۰۷ء ص ۱۴، ص ۶۵۔۶۶

۳۶۔ مولانا ظفر علی خان نے فروری ۱۹۲۰ء کے اس خطاب میں مولانا شبلی کے درج ذیل اشعار اقتباس کیے

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استاد
یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ شرانگیزیاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر اس کا ہو گا امتحاں کب تک
یہ مانا ہے فلک سے تم کو شکوہ خشک سالی کا
ہمارے خون سے سینچو گے اپنی کھیتیاں کب تک
عروس بخت کی خاطر تمھیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے خون فشاں کب تک
کہاں تک ہم سے لوگے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

مشتاق احمد (مرتب) خطبات صدارت فدائے ملت مولانا ظفر علی خان کوٹلہ: قومی دار الاشاعت ۱۹۲۱ء ص ۲۰،۱۹

۳۷۔ یہ نظم مولانا ظفر علی خان کے کسی شعری مجموعے میں شامل نہیں دیکھیے راقم کی کتاب ظفر علی خان۔ خطوط وخیوط لاہور: مسند ظفر علی خان، پنجاب یونی ورسٹی ۲۰۱۲ء ص ۱۶۱

۳۸۔ مرغزار ظفر علی خان نمبر، مدیر: عبدالجبار شاکر، شیخوپورہ: گورنمنٹ کالج، ۱۹۸۱ء ص ۲۸۸

برطانوی عہد میں مچھلی بازار کان پور میں واقع ایک مسجد کی شہادت پر مسلمانان کان پور نے احتجاج کیا، اور احتجاجی جلسے کے بعد مسجد کے منہدم حصے کو دوبارہ تعمیر کرنے لگے۔ اس عمل میں جوانوں کے ساتھ بچے بھی شامل تھے۔ تعمیر نو کرنے والوں پر حکام نے بیدردی سے گولیاں چلائیں جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں بچے اور نوجوان شہید ہوگئے۔ ۳ مئی ۱۹۱۲ء کے اس سانحہ پر مولانا شبلی نعمانی نے ذیل کی نظم لکھی، جو اس زمانے میں بچے بچے کی زبان پر جاری تھی۔ مولانا ظفر علی خان نے اسی نظم کا انگریزی ترجمہ کیا:

ہم کشتگان معرکہ کان پور ہیں

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں

آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر — نیند آ گئی ہے منتظر نفخ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب — ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ — مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینہ پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار — از بسکہ مستِ بادۂ ناز و غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر — لذت شناسِ ذوق دل ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا — جو خاک وخوں میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا — ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں

کلیاتِ شبلی اُردو ص۸۴

۳۹ شبلی نعمانی باقیات شبلی مکتوب بنام مولوی بشیرالدین لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۶۵ء ص ۱۶۰
۴۰ یادگارِ شبلی ص ۲۳۵
۴۱ مکتوباتِ شبلی ص ۶۳-۶۴
۴۲ ایضاً ص ۱۱۸
۴۳ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مولانا شبلی پر ایک نظر اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی یوپی ۲۰۰۸ء ص ۵۳
۴۴ مکتوباتِ شبلی ص ۷۳
۴۵ یہ شعر صائب کا ہے دیکھیے: کلیات صائب تبریزی ازروی نسخہ خطی کہ خود شاعر تصحیح نمودہ است، تہران: انتشارات خیام ۱۳۷۳ ھ ش غزل نمبر ۹ ص ۴
۴۶ چراغ حسن حسرت کاشمیری مردمِ دیدہ لاہور: دارالاشاعت ۱۹۳۹ء
۴۷ مکتوباتِ شبلی ص ۶۵-۶۶
۴۸ زاہد منیر عامر مولانا ظفر علی خان کتابیات اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۳ء
۴۹ مردمِ دیدہ محولہ بالا
۵۰ سید سلیمان ندوی (مرتب) مکاتیب شبلی اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ یوپی ۲۰۱۲ء جلد دوم ص ۳۸
۵۱ حیاتِ شبلی ص ۴۶۱
۵۲ یہ قول سید سلیمان ندوی کا ہے دیکھیے: کلیات شبلی اردو ص ۱۵
۵۳ کلیات شبلی اردو ص ۶۷، ۶۸ حیاتِ شبلی ص ۴۶۱
۵۴ روزانہ ہمدرد دہلی ۵/ جون ۱۹۱۳ء بحوالہ افضل حق قرشی "نوادرِ شبلی" در صحیفہ شبلی نمبر مدیر افضل حق قرشی لاہور: مجلس ترقی ادب، جولائی۔دسمبر ۲۰۱۴ء شمارہ ۲۱۸-۲۱۹ ص ۸۲
۵۵ مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۱۳۷
۵۶ پروفیسر احمد سعید (مرتب) روزنامہ زمیندار کے اداریے مقالہ ہائے افتتاحیہ اور شذرات لاہور: مولانا ظفر علی

خان ٹرسٹ ۲۰۱۴ء

زمیندار کے ۱۹ر جنوری ۱۹۲۳ء کے اداریے میں مولانا شبلی نعمانی کو بہ این الفاظ یاد کیا گیا ہے ......''مولانا شبلی نعمانی نوراللہ مضجعہ نے اپنی زندگی میں جو عظیم الشان علمی اور مذہبی خدمات انجام دیں ان میں دارالمصنفین کی تاسیس ہماری نظر میں سب سے اول نمبر پر آتی ہے ۔ایک بالغ نظر، روشن دماغ اور محقق عالم کے لیے عمدہ سے عمدہ جامع سے جامع اور سودمند سے سودمند تالیفات و تصنیفات کی ترتیب اگرچہ بجائے خود اس کے ابنائے وطن اور اس کے برادرانِ ملت کے دائمی فخر وناز کا سرمایہ ہے لیکن دنیا میں اس قسم کے مصنفین اگر زیادہ نہیں رہے تو کم بھی نہیں رہے۔ مگر اپنے شروع کیے ہوئے کام کے مستقل اور دائمی اجر اور اپنی قائم کی ہوئی بنیادوں پر عالی شان قصروں کی تعمیر کا اہتمام ایک ایسا نادر کارنامہ ہے جس کی توفیق بہت کم خوش نصیبوں کو ملی ہے'' ص ۴۷

۵۷۔ صحیفہ شبلی نمبر ص ص ۶۳۹۔۶۴۴

۵۸۔ ظفرعلی خان ادیب و شاعر ص ۱۱۵

۵۹۔ مدیرالندوہ: الندوہ نومبر ۱۹۱۴ء جلد ۱۰ ش ۵ ص ۲۴۔۲۸ در شبلی معاصرین کی نظر میں ص ۱۴۶

۶۰۔ نظم ''دارا پور'' سرودہ در جہلم ۱۹۴۰ء ظفرعلی خان چمنستان لاہور: پبلشرز یونائیٹڈ ۱۹۴۴ء ص ۲۷۷ فیض اور صحبت کا اکٹھا استعمال باعث تعجب ہے۔ شاید فیضِ صحبت کہا ہو.....؟

.... انتہا ....

’دوجذبیت‘ کے تناظر میں شبلی کی تنقید کا تجزیہ

ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ

ABSTRACT:

This article aims at interpreting Shibli Nomani's critical writings from the perspective of 'Ambivalence' which is though basically a psychological term, employed in postcolonial studies by Homi K Bhabha and others. Shibli and his contemporaries like Sir Sayyad, Nazir Ahmad and Hali possessed ambivalent views towards Europe. Shibli eulogizes and criticises European culture and her achievements at the same time. His ambivalent thinking doesn't engender any confusion but proves an intellectual strategy to subvert hierarchy of West and East fashioned by colonial powers.

علی گڑھ اور سرسید سے شبلی کا تعلق ’دوجذبیت‘ یعنی تحسین وتنقید اور کشش وگریز کا بہ یک وقت حامل تھا؛ شبلی، علی گڑھ وسرسید کے مداح بھی تھے اور نقاد بھی۔ یہ بات درست ہے کہ شبلی کی ذہنی تشکیل میں علی گڑھ کا اہم حصہ تھا، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شبلی نے خود کو علی گڑھ کے اثرات سے آزاد کرنے کی اسی طرح کی کوشش کی، جو ایک بیٹا اپنے باپ سے جدا اپنی شناخت کے لیے کرتا ہے۔ شبلی کی تنقید پر بیش تر گفتگو میں بھی شبلی کے اسی دوجذبی رجحان کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مگر دیکھنے والی بات یہ ہے کہ شبلی کی دوجذبیت کس حد تک ’ثقافتی علمیاتی‘ تھی، اور کہاں تک ’شخصی نفسیاتی‘ تھی؟ نیز وہ کہاں تک اس کے زیر اثر رہے اور کہاں اس کے اثر سے آزاد ہوئے؟

سید سلیمان ندوی کی حیاتِ شبلی اور شیخ محمد اکرام کی یادگارِ شبلی، شبلی کے دوجذبی رجحان کی جڑیں ان ذاتی نظریات میں تلاش کرتی ہیں، جو شبلی کے بچپن کے بعض خاص واقعات کے سبب انھوں نے اختیار کیے تھے۔ سرسید اور شبلی میں اختلاف کا بڑا نکتہ جدید تعلیم تھی۔ سید سلیمان ندوی نے شبلی اور سرسید کے اختلافات کے ذیل میں ایک واقعہ لکھا ہے ”مولانا [شبلی] نے ندوہ کے کسی جلسے میں یا کہیں اور ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹتے جائیں، پیچھے ہٹتے جائیں

یہاں تک کہ صحابہ کی صف سے جا کر مل جائیں۔ سرسید کو اس تقریر پر بڑا غصہ آیا۔ چناں چہ اس کے خلاف انھوں نے سخت مضمون لکھا'۔ سرسید کو غصہ آنا ہی تھا شبلی کی رائے نے ان کے ترقی کے تصور پر ضرب لگائی تھی۔ سرسید سمجھتے تھے کہ ترقی مستقبل پر نظر رکھنے کا نام ہے۔ سرسید ماضی کی کلیتاً نفی نہیں کرتے تھے مگر شبلی کی مانند ماضی کی اس کی 'اصلی شکل' میں احیا کے حامی نہیں تھے۔ سرسید ماضی کی نئی تشکیل اور 'بازیافت' (بہ معنی Reclamation) چاہتے تھے۔ دوسری طرف شبلی بازیافت کے بجائے احیا کے حامی تھے؛ پرانے عہد کی جرأت مندانہ اجتہادی تعبیر کے بجائے ،اس کی قدیمی واصلی شکل میں واپسی چاہتے تھے۔ اس سب کے باوجود شبلی کے خیالات کے ساتھ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ ماضی کے ایک خاص عہد کا رومانوی تصور رکھتے تھے، مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے دل میں ماضی کے ایک مثالی عہد کی لازوال محبت محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ ،زمانہ ءحال کی 'ناقص'، جدید، انگریزی کی تعلیم' کی حمایت بھی کرتے تھے ۔مثالی و ناقص تصورات کا یہ عجب اجتماع تھا،جس میں وہ ایک دوسرے کے لیے ناگزیر بھی تھے، اور ایک دوسرے سے گریزاں بھی تھے! یہی نہیں، جدید تعلیم کے تعلق سے بھی شبلی کا نقش قدم جناب شیخ کی مانند یوں بھی تھا اور یوں بھی ؛یعنی دوجذبی میلان کا حال تھا۔ سید سلیمان ندوی ہی نے لکھا ہے کہ "علی گڑھ تحریک کا دوسرا اثر ان پر یہ ہوا کہ انگریزی تعلیم کی ضرورت ان پر الم نشرح ہوگئی۔ اپنے عزیزوں اور برادری کے لوگوں کو اس کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کا کام انھوں نے خود شروع کیا...علی گڑھ کے چار ہی مہینے کے قیام کے بعد انھوں نے تہیہ کیا کہ اپنے شہر میں وہ انگریزی تعلیم کا ایک سکول جاری کریں"۔ ۲ ایک طرف علی گڑھ کے قیام کے چار مہینے انھیں انگریزی سکول جاری کرنے کی تحریک دیتے ہیں،(اور بعد میں ندوہ کے نصاب میں انگریزی کی شمولیت پر اصرار بھی کیا) تو دوسری طرف اسی دوران میں وہ جدید تعلیم پر اپنے اوّلین تبصرے میں فرماتے ہیں: "یہاں آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہوگئے۔معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے،مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی ،بلند ہمتی،ترقی کا جوش برائے نام نہیں،یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا۔بس خالی کوٹ پتلون کی پیدائش گاہ ہے"۔ ۳ کون سے خیالات مضبوط ہوئے؟ ظاہر ہے یہ وہی خیالات تھے جو بچپن میں قائم ہوئے ،یا جنھیں انھوں نے مولانا فاروق چریا کوٹی سے سیکھا تھا۔ان دونوں باتوں سے ایک ہی نکتہ واضح ہوتا ہے کہ شبلی کے یہاں سرسید،علی گڑھ، جدید تعلیم، انگریزی، ترقی وغیرہ کے ضمن میں باہم متخالف خیالات کی لہریں بہ یک وقت رواں تھیں۔ایک طاقت ور لہر انھیں بچپن، ماضی، عہد گزشتہ کی طرف کھینچتی تھی ،اور دوسری لہر جدید دنیا، اور حال کی جانب بلاتی تھی۔ چناں چہ شیخ محمد اکرام نے شبلی کی جدید تعلیم کی مخالفت کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "شبلی کے باقی سب بھائیوں نے کالجوں میں تعلیم پائی ،اور وہ اپنے گھر میں جدید کے خلاف قدیم کے ترجمان تھے، بلکہ شاید نفسیات کا طالب علم تو یہ کہے گا کہ ان کے تحت الشعور میں جدید تعلیم کی نسبت وہی خیالات و جذبات تھے، جو اپنے گھر میں سوتیلی والدہ کی نسبت تھے۔تکمیل تعلیم کے بعد جب انھیں انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے معمولی ملازمتیں بھی نہ ملیں تو انگریزی تعلیم کے خلاف ان کا غم وغصہ اور بڑھ گیا"۔ ۴

حقیقت یہ ہے کہ شیخ محمد اکرام پہلے شخص ہیں جنھوں نے شبلی کے دوجذبی رجحان کو بہ یک وقت شخصی،

نفسیاتی 'اور' ثقافتی، علمیاتی 'ٹھہرایا۔ انھوں نے اس جانب متوجہ کیا کہ کس طرح عوامی زندگی میں اہم کردار ادا کرنے والے شخص کی ذاتی وسماجی زندگی کی سرحدیں مٹ جاتی ہیں؛ اس کی لاشعوری پیچیدگی، اس کی علمی زندگی میں راہ پالیتی ہے؛ یا کیسے ایک نجی واقعے کی سرحد پگھل کر سماجی حقیقت سے جا ملتی ہے! شیخ محمد اکرام کے مذکورہ اقتباس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شبلی کے لیے انگریزی، ان کی سوتیلی والدہ کی طرح 'غیر کفو' تھی، جیسے ان کے والد کی مانند حکمرانوں نے زبردستی مسلط کیا تھا؟ کیا شبلی اپنی روایت، مادری زبان سے وہی محبت کرتے تھے، جو انھیں اپنی حقیقی ماں سے تھی؟ کیا شبلی یہ خیال بھی کرتے تھے کہ انگریزی نے سوتیلی والدہ کی طرح، مادری زبان و کلچر کی جگہ لینے کی کوشش کی؟ شیخ محمد اکرام کی توجیہ سے یہ سب سوالات پیدا ہوتے ہیں، اور ہمیں شبلی کے دوجذبی رجحان کی نفسیاتی وجوہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ شبلی کی ذاتی زندگی کا دبدھا یہ تھا کہ وہ اپنی سوتیلی والدہ کو ناپسند کرنے کے باوجود، وہ اس امر کو تسلیم کرنے پر مجبور تھے کہ وہ ان کے والد کی جائز بیوی، اور ان کی والدہ تھیں؛ شبلی کے شخصی جذبات کا تصادم اس 'حقیقت' سے تھا جو سماجی وثقافتی دنیا میں خود کو جائز اور بجا ثابت کرنے کی 'پوزیشن' میں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شبلی کا دوجذبی رجحان محض ایک شخصی، نجی معاملہ نہیں، ایک ثقافتی معاملہ تھا۔

قصہ یہ ہے کہ دوجذبیت، انیسویں صدی کے اواخر اور اوائل بیسویں صدی کی ثقافتی فضا پر اس درجہ چھائی ہوئی نظر آتی ہے کہ اس سارے عرصے کی علمیات میں بھی سرایت کرتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ نکتہ تھوڑا تفصیل طلب ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے نصف تک برصغیر کی سماجی و ثقافتی دنیا پر نوآبادیات غالب تھی۔ اس دنیا میں، اور اس دنیا کے جو معانی قائم کیے جارہے تھے، وہ دوجذبی حالت کے تحت قائم کیے جارہے تھے۔ نوآبادیات اور دوجذبیت کے تعلق پر سب سے پہلے ہومی بھابھا نے لکھا تھا۔ بھابھا نے استعمار کار اور استعمار زدہ کے رشتے کی وضاحت میں کہا کہ اس میں صرف مزاحمت یا صرف متابعت نہیں ہوتی، بلکہ دوجذبیت یعنی Ambivalence ہوتی ہے۔ بھابھا دوجذبیت کو استعمار کار اور استعمار زدہ دونوں کے یہاں دیکھتے ہیں۔ بھابھا کی بنیادی دلیل یہ ہے کہ ''نوآبادیاتی کلامیہ (Colonial Discourse) دوجذبی ہونے پر مجبور ہے، کیوں کہ اس کلامیہ کا یہ منشا کبھی نہیں ہوتا کہ استعمار زدہ کبھی، استعمار کار کی ٹھیک ٹھیک نقل بنیں، اس لیے کہ یہ خطرناک ہوگا۔ مثال کے طور پر بھابھا چارلس گرانٹ کی مثال دیتے ہیں، جس نے ۱۷۹۲ء میں ہندوستانیوں میں عیسائیت کی ترویج کی خواہش کی، مگر اسے یہ پریشانی بھی لاحق ہوئی کہ کہیں اس سے یہ لوگ آزادی کے لیے سرکش نہ ہوجائیں۔ لہٰذا گرانٹ نے اس کا یہ حل نکالا کہ عیسائی عقائد کو ذات پات کی تفریق سے آمیز کردیں، تاکہ جزوی اصلاح ہو، اور انگریزی آداب کی کھوکھلی نقل کی ترغیب ہو'۔۵ 'جزوی اصلاح' دوجذبیت کو جنم دیتی ہے؛ وہ انگریزی آداب کی نقل کرتے ہیں، مگر اس 'یورپی روح' سے نابلد رہتے ہیں، یا ناپسند کرتے ہیں جس نے یورپ میں روشن خیالی پیدا کی، اور علوم کی آزادانہ تخلیق کو ممکن بنایا۔ دوسری طرف انگریزی آداب کی نقل میں انگریزی آداب کا مضحکہ اڑانے کی راہ بھی ہموار ہوتی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے دوجذبیت کی مزید وضاحت ضروری ہے۔

دوجذبیت، نفسی صورتِ حال ہے جو کسی ایک معروض کے سلسلے میں دو متضاد و متصادم جذبات وخیالات

سے پیدا ہوتی ہے۔ دوجذبیت کی کم از کم تین حالتیں ہیں: مرتکز، منتشر اور متذبذب۔ یعنی اگر ایک ہی وقت میں کسی شے کے سلسلے میں محبت و نفرت ہو، اور دونوں میں یکساں شدت ہو تو یہ مرتکز حالت ہے، اور اگر کسی وقت تحسین کے خیالات اور کسی دوسرے وقت تنقیص کے خیالات ہوں تو یہ دوجذبیت کی منتشر حالت ہے؛ کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کسی شے کی آرزو اور ترک کے جذبات ہم قرین (overlap) ہونے لگتے ہیں، اسے تذبذب کی حالت کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً شکیل بدایونی کا شعر:

ہم ترک ربط و ضبط محبت کے باوجود
سو بار کھنچ کے کوچہ جاناں میں آگئے

متذبذب حالت کو پیش کرتا ہے۔ مابعد نوآبادیاتی مطالعات میں دوجذبیت کی ان مختلف حالتوں کا ذکر نہیں کیا گیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے بغیر ہم نہ تو استعمار کار اور استعمار زدہ کے رشتے کی سب نزاکتوں کو سمجھ سکتے ہیں، اور نہ ان تمام کلامیوں کی صحیح نوعیت سے آگاہ ہوسکتے ہیں جنھیں استعمار کاروں نے شروع کیا، یا جنھیں استعمار زدوں نے قبول کیا، یا جنھیں استعمار زدوں نے وضع کیا۔

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا، دوجذبیت نفسی حالت ہے، اور پیچیدہ نفسی حالت ہے۔ جو بات اسے پیچیدہ بناتی ہے، وہ متضاد احساسات کے ذریعے معروض یا دنیا کی تعبیر ہے۔ ہم اپنے ایک قسم کے احساس یا ملتے جلتے احساسات کے ذریعے بھی دنیا کے معنی متعین کرتے ہیں، اور یہ معنی عموماً احساس یا احساسات کے مجموعے کے 'لسانی مساوی' (Linguistic equivalent) تلاش کرنے کی کوشش ہوتے ہیں۔ متضاد احساسات، کسی ایک احساس کی مرکزیت کو قائم نہیں ہونے دیتے؛ ایک احساس دوسرے، مختلف احساس سے اولنے بدلنے کی جستجو میں رہتا ہے، اور احساس کی یہ تحرک، اضطراب نہ صرف نفسی توانائی کو بڑھاتا ہے؛ یعنی تحسین و تنقیص میں مبالغے، محبت و نفرت میں شدت پیدا کرتا ہے، بلکہ انسان کی 'جذباتی یادداشت' اور 'علم پر مبنی یادداشت' کو مہمیز بھی کرتا ہے۔ یہ تینوں باتیں معروض یا دنیا کی تعبیر پر اثرانداز ہوتی ہیں؛ یعنی تحسین و تنقیص میں ایک جذباتی، مبالغہ آمیز پیرایہ اختیار کیا جاتا ہے؛ ان علامتوں، کہانیوں کو ابھارا جاتا ہے، جن سے دوجذبیت کی زد پر آئے ہوئے شخص کو جذباتی وابستگی ہوتی ہے (دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں!)، اور دنیا و معروض کی ان باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو محض معلومات کا درجہ رکھتی ہیں۔ تاہم دوجذبیت، جذباتی یادداشت کو شدت سے مہمیز کرنے کا میلان رکھتی ہے۔ جیسے شبلی کے یہاں انگریزی کے سلسلے میں ان کی سوتیلی والدہ سے متعلق جذباتی یادداشت مہمیز ہوئی، اور کیا عجب کہ یہی یادداشت پھر انھیں قدیم اسلامی تاریخی ادوار کی طرف متوجہ کرگئی ہو! بہرکیف دوجذبی حالت میں ماضی کے وہ قصے، واقعات، روایات، زمانے اچانک یاد آنے لگتے ہیں، اور تخیل و تعقل دونوں پر اثرانداز ہونے لگتے ہیں، جن سے لوگوں کو جذباتی وابستگی رہی ہوتی ہے۔ یعنی نئی لفظیات اور نیا اسلوب رونما ہونے لگتا ہے۔ اسی ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ دوجذبیت کی حالت میں قائم کیے گئے معانی میں 'مرکزیت' نہیں ہوتی۔

دوجذبیت کی حالت میں قائم کیے گئے معانی کو سماجی و ثقافتی دنیا میں ظاہر ہونا ہوتا ہے، اس بنا پر دوجذبیت

محض نجی، شخصی نفسی حالت نہیں رہتی ..... یوں بھی کوئی اظہار جب لسانی پیرایہ اختیار کرتا ہے تو وہ نجی نہیں رہ جاتا؛ کیوں کہ لسانی پیرایہ اختیار کرتے ہی وہ باہر کی طرف، دوسروں کی طرف جست بھرتا ہے، اور یہ موقع پیدا کرتا ہے کہ اس کی تفہیم 'باہر' اور 'دوسرے' کے تناظر میں کی جائے، یا زیادہ مناسب لفظوں میں کوئی بھی لسانی اظہار اپنے قارئین و سامعین تک رسائی کے دوران ہی میں اپنے اندر سے ایک رخنہ نمودار کرتا ہے، جس میں 'دوسرا' اور 'باہر' کا تناظر داخل ہوسکتا، اور اس کی نجی دوشیزگی غارت کرسکتا ہے .....دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دو جذبیت اپنی بنیاد میں داخلی نفسیاتی حالت ضرور ہے، مگر اپنے ظہور میں خارجی ہے، یعنی سماج و ثقافت کی طرف اڈلنے کا میلان رکھتی ہے۔دو جذبیت بیگانگی محض کی حالت نہیں ہے؛ یہ تعلق وترکِ تعلق کی جدلیات کی مدد سے معروض سے مسلسل وابستہ رہتی ہے۔اسی کیفیت سے متعلق مظفر علی اسیر کا کیا اچھا شعر ہے:باقی ابھی ہے ترکِ تمنا کی آرزو کیوں کر کہوں کہ کوئی تمنا نہیں مجھے؛ جس طرح ترکِ تمنا کی آرزو، تمنا کی نفی و اثبات کا کھیل ہے، اسی طرح دو جذبیت بھی نفی و اثبات کی جدلیات کو پیش کرتی ہے۔معروض و دنیا کی نفی کے عمل میں اس کا اثبات کیا جاتا ہے، اور اس کے اثبات میں نفی کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ یوں دو جذبیت، معروض سے اپنے تعلق اور معروض کے معنی کو مسلسل 'بے مرکز' رکھتی ہے، منتشر کیے رکھتی ہے، اس کے کسی ایک قطعی بیانیہ کو قائم ہونے نہیں دیتی؛ اپنی جذباتی دنیا میں اس کی حاکمیت کو مسلط نہیں ہونے دیتی؛ اس کے کسی واحد، یکساں، بتجانس معنی کو اندر ہی سے کھد یڑتی رہتی ہے۔دوسرے لفظوں میں دو جذبیت مزاحمت ہوتی ہے، مگر کھلی جارحیت نہیں۔اس کا دائرہ عمل اپنے معروض کی تعبیریت (Hermeneutics) ہوتا ہے، عملی سیاست نہیں۔یہ ان بیانیوں، کلامیوں تحریروں میں ظاہر ہوتی ہے جنھیں ایک معروض کا علمی و تعبیری سطحوں پر سامنا کرنے کے لیے وضع و اختیار کیا جاتا ہے۔لہٰذا یہ اتفاق نہیں کہ انیسویں صدی کے اواخر اور اوائل بیسویں صدی کی اردو تحریریں جس نوع کی تعبیریت کی حامل ہیں، وہ اپنی اصل میں دو جذبی ہے۔

سرسید، آزاد، شبلی، حالی، نذیر احمد کے لیے معروض 'یورپ' تھا۔ان سب کے یہاں ہمیں یورپ کے سلسلے میں کم یا زیادہ دو جذبی رجحان ملتا ہے؛ وہ یورپ کی آرزو بھی کرتے ہیں، یورپ نقل کی سعی بھی کرتے ہیں اور یورپ کی آرزو اور نقل کرنے والوں پر تنقید بھی کرتے ہیں؛ وہ یورپ کی تہذیب، زبان، ادبیات، آداب، طرزِ حکومت، علمی کارناموں کی مدح سرائی کرکے ان کی مانند عظمت کے حصول کی تمنا بھی کرتے ہیں، اور یورپ کی علمی روایات میں تعصب کا ذکر بھی کرتے ہیں، اور اپنے قارئین کو خبردار کرتے ہیں ۔یعنی یورپ ایک پدری شبیہ (Father Figure) ہے؛ جس سے ہمارے لکھنے والوں کا تعلق ایڈیپس تعقید کی طرح پیچیدگی کا شکار ہے۔وہ عظمت کا تصور پدری شبیہ سے مستعار لیتے ہیں، مگر ساتھ ہی عظمت کے حصول میں اس پدری شبیہ کو حائل بھی دیکھتے ہیں۔یہاں ہم صرف شبلی کے یہاں سے مثالیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

یورپ نے کسی زمانہ میں مسلمانوں کے خلاف جو خیالات قائم کر لیے تھے، ایک مدت تک وہ علانیہ اس طریقہ سے ظاہر کیے جاتے تھے کہ مذہبی تعصب کا رنگ صاف نظر آتا تھا۔ لیکن جب

یورپ میں مذہب کا زور گھٹ گیا اور مذہبی ترانے بالکل بے اثر ہوگئے تو اس پالیسی نے دوسرا پہلو بدلا۔ اب یہ طریقہ چنداں مفید نہیں سمجھا جاتا کہ مسلمانوں کی نسبت صاف صاف متعصبانہ الفاظ لکھے جائیں، بلکہ بجائے اس کے یہ دانش مندانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومتوں، اسلامی قوموں، اسلامی معاشرت کے عیوب تاریخی پیرایہ میں ظاہر کیے جاتے ہیں۔ اور عام تصنیفات، قصوں، ناولوں، ضرب المثلوں کے ذریعے وہ لٹریچر میں اس طرح جذب ہوجاتے ہیں کہ تحلیل کیمیادی سے بھی جدا نہیں ہو سکتے... یورپ میں مصنفین کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور اس وجہ سے ان میں متعصب، نیک دل، ظاہر بیں، دقیق النظر ہر درجہ اور ہر طبقے کے لوگ ہیں، لیکن ترکوں کے ذکر میں وہ اختلاف مدارج بالکل زائل ہوجاتا ہے۔٦

عجیب بات یہ ہے کہ یورپ نے فارسی زبان کے ساتھ مسلمانوں سے زیادہ اعتنا کیا۔ مسلمانوں کو اسلام سے قبل فارسی زبان کی ایک تصنیف کا بھی پتہ معلوم نہ تھا، لیکن یورپ نے ان تصنیفات کا اس قدر سرمایہ جمع کر لیا کہ زردشت سے لے کر نوشیرواں کے عہد تک زبان کی پوری تاریخ مرتب ہوگئی۔٧

ان دو اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ متعصب و مکار بھی ہے اور علم دوست و نیک دل بھی ہے؛ ظاہر بیں بھی ہے اور دقیق النظر بھی۔ یہی دو جذبی رجحان یورپ اور اس کے جملہ مظاہر، جیسے انگریزی تعلیم، انگریزی تہذیب، جدید علوم اور خود انگریزوں کے ضمن میں ہمیں شبلی اور ان کے معاصرین کے یہاں ملتا ہے؛ تاہم سب کے یہاں اس رجحان کی حالتیں مختلف ہیں۔ شبلی کے یہاں ہمیں منتشر اور متذبذب حالت ملتی ہے۔ یعنی شبلی کسی وقت یورپ کے علمی کارناموں کی تحسین کرتے ہیں، اور کسی دوسرے وقت انھی کارناموں میں خرابیوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ نیز بعض اوقات ایک ہی سانس میں یورپ کی عظمت و پستی کا ذکر کرتے ہیں۔ پہلی نظر میں یہ محض ایک انصاف پسندانہ علمی رویہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی معروض کی خرابیوں کے بیان کے ساتھ ساتھ اس کی خوبیوں کا بھی اعتراف کیا جائے۔ لیکن جب ہم اس علمی رویے کا مطالعہ نوآبادیاتی سیاق میں کرتے ہیں تو ہم پر کھلتا ہے کہ یہ ایک نئی حسیت اور نئی علمیات ہے؛ تضاد کو بہ یک وقت گرفت میں لینے کی حسیت، اور جدلیاتی تصور کے تحت معنی یابی کی علمیات۔ نیز ایک ایسی طاقت سے معاملے کی حکمت عملی بھی ہے، جو اردو گرد، یہاں وہاں، تعلیم، ثقافت، سیاست، زبان، زبانوں کی درجہ بندی، ذرائع ابلاغ، عمارتوں، دفتروں، اداروں، کتابوں، بیانیوں کی صورت موجود ہے، اور چھا جانے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ طاقت فاصلہ پسند کرتی ہے، مگر ایک ایسا فاصلہ جہاں سے وہ اپنے اثبات و اجارے کے تاثر کی نہایت پراثر اور پرشکوہ ترسیل کر سکے؛ یعنی محکوموں کے دل میں اپنی نقل کی آرزو پیدا کر سکے، مگر اس آزادی و علم سے دور رکھ سکے، جس کے بل پر وہ حکمرانی کر رہی ہے۔ وہ ایک کثیر سمتی معروض ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور اوائل بیسویں صدی میں 'یورپ' محض ایک براعظم نہیں سمجھا گیا تھا، بلکہ مذکورہ طاقت کا بت ہزار شیوہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں 'یورپ' نمائندگی کا ایک ہشت پہلو نظام تھا۔ چناں چہ یورپ کا ذکر کرتے

ہوئے، یا کسی یورپی خیال، یورپی علم، یورپی تہذیب، یورپی مصنف سے بحث کرتے ہوئے، طاقت کا بت ہزار شیوہ بنیادی حوالہ بن جاتا تھا؛ نمائندگی کا ہشت پہلو نظام، دلیل و منطق اور استنباطِ نتائج پر اثر انداز ہوتا تھا۔

شبلی کی تنقید پر دو جذبیت کی علمیات کا اثر ہے۔ اس اثر کی پہلی صورت یہ ہے کہ ان کی تنقید میں جہاں یورپ سے استفادے کی کوشش ملتی ہے، وہاں یورپ کے لیے کشش و گریز کے میلانات بہ یک وقت ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ یورپی ارسطو، جان سٹوارٹ مل، ہنری لوئیس اور نامعلوم یورپی مصنفین کے خیالات کو مستند بنا کر بھی پیش کرتے ہیں، اور ان کے استناد کو چیلنج بھی کرتے ہیں۔ کہیں تو یہ صورت بھی پیدا ہوئی ہے کہ شاعری کی حقیقت سے متعلق ایک یورپی مصنف کے ایک خیال سے اختلاف کرتے ہیں، اور آگے چل کر اسی خیال کو قطعی دلیل بناتے ہیں؛ یعنی یورپ ان کی تحسین اور تنقید کا بہ یک وقت محور بنتا ہے۔ مثلاً شعر العجم کی پہلی جلد میں شعر کی حقیقت سے بحث کرتے ہوئے جان سٹوارٹ مل کی رائے درج کر کے اس سے اختلاف کرتے ہیں۔

> ''جو کلام اس قسم کا ہوگا کہ اس سے جذباتِ انسانی برانگیختہ ہوں اور اس کا مخاطب حاظرین نہ ہوں، بلکہ انسان خود اپنا مخاطب ہو، اس کا نام شاعری ہے'' مل صاحب کی یہ تعریف اگرچہ نہایت باریک بینی پر مبنی ہے، لیکن اس سے شاعری کا دائرہ نہایت تنگ ہو جاتا ہے، اور اگر معیار ہی قرار دیا جائے تو فارسی اور اردو کا دفتر بے پایاں بالکل بےکار ہو جائے گا۔۸

شعر العجم کی چوتھی جلد میں ایک بار پھر مل صاحب کی تقریر (جو دراصل ان کے مضمون کا ترجمہ ہے) کا مذکورہ حصہ درج کرتے ہیں، مگر اس مرتبہ اس رائے کو شاعری کی حقیقت کے ضمن میں حتمی دلیل بناتے ہیں۔

> اصلی شاعری وہ ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو۔ شاعر اگر اپنے نفس کے بجائے دوسروں سے خطاب کرتا ہے، دوسروں کے جذبات کو ابھارنا چاہتا ہے؛ جو کچھ کہتا ہے، اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے کہتا ہے تو شاعر نہیں خطیب ہے۔ اس سے یہ واضح ہوگا کہ شاعری تنہا نشینی اور مطالعہ نفس کا نتیجہ ہے۔۹

غور کیجیے: ابتدا میں شبلی نے یہ رائے قائم کی کہ اگر مل صاحب کی اس بات سے اتفاق کر لیا جائے کہ شاعری میں انسان اپنا مخاطب آپ ہوتا ہے تو فارسی اور اردو کا دفترِ بے پایاں بے کار ہو جائے گا، مگر آگے چل کر اسی شاعری کو حقیقی شاعری قرار دیتے ہیں جو دوسروں کے لیے نہیں، اپنے لیے لکھی گئی ہو۔ جو شخص دوسروں کے لیے کہتا یا لکھتا ہے، وہ اب شبلی کی نظر میں شاعر نہیں خطیب ہے، کیوں کہ 'خطیب دوسروں کے جذبات کا نباض ہوتا ہے'۔ پہلے شبلی کے یہاں شاعری کا جو تصور علمی طور پر ناقص اور مقامی شاعری کے لیے اجنبی وغیرہ تھا، آگے وہی تصور شاعری کا مثالی تصور اور معیار ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ دونوں آرا میں وہی شدت ہے جو ہمیں دو جذبی میلان میں نظر آتی ہے؛ یعنی ایک ہی شے کے انکار اور اثبات میں یکساں نوعیت کی شدت ہوتی ہے۔ شبلی کی تنقیدی آرا میں تضاد و تردید کے در آنے کا سبب ہم ان کے حافظے کی کمزوری میں نہیں تلاش کر سکتے۔ حافظہ دھوکہ دے سکتا ہے، ایک خیال کو ذہن سے محو کر سکتا ہے، مگر نیا استدلال نہیں دے سکتا۔ شبلی جب اپنی پہلی رائے کے برعکس رائے قائم کرتے ہیں تو

ایک نیا استدلال بھی لاتے ہیں۔اس نئے استدلال کا اہم جز شاعر و خطیب کا موازنہ ہے(گو یہ استدلال بھی مل سے ماخوذ ہے)۔گویا شبلی شاعری کی حقیقت کے سلسلے میں دو مختلف وقتوں میں دو مختلف استدلال پیش کرتے ہیں۔اسی مقام پر ایک اور بات بھی توجہ چاہتی ہے۔شبلی نے یہاں شاعر اور خطیب میں جس فرق کا ذکر کیا ہے،اور جس طرح شاعری کو 'تنہا نشینی' اور خطابت کو 'مجلس آرائی' کا استعارہ بنایا ہے،کیا وہ شخصی و نجی زندگی اور سماجی و ثقافتی زندگی کی اسی جدلیات کی تمثیل نہیں ہے،جو دو جذبیت کی روح رواں ہے؟

مل ایک اہم فلسفی ،مگر معمولی نقاد تھے۔ بر سبیلِ تذکرہ یہ وہی فلسفی تھے جنھوں نے اپنی کتاب *On Libertry* میں لکھا ہے کہ شخصی آزادی کا تصور یورپیوں کے لیے مناسب ہے،مگر "وحشیوں پر حکومت کرنے کے لیے مطلق العنانیت(Despotism) ایک جائز طریقہ ہے،بشرطیکہ مقصد ان کی اصلاح ہو"۱۰۔یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس امر کو طے کرنے کا اختیار 'مہذب یورپ' کو تھا کہ وحشی کون ہیں،اور ان کی اصلاح کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے جانے مناسب ہیں۔خیر!مل نے ۱۸۳۳ء میں Thoughts on Poetry and its Varieties کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا،جس کے کچھ حصوں کا ترجمہ شبلی نے شعرا العجم کی پہلی اور چوتھی جلد کے شروع میں درج کیا ہے۱۱۔مل نے شاعری کا وہی رومانوی تصور دہرایا ہے جسے ورڈز ورتھ نے پیش کیا تھا،اور کہیں بہتر انداز میں شیلے اپنے مضمون *Defence of Poetry* میں واضح کیا تھا۔مل نے شاعری کی تعریف یہ کی: شاعری جذبات پر اثر کرتی ہے۔یہ تصور ورڈز ورتھ نے پیش کیا تھا،اور اسی بنا پر شاعری کو سائنس سے ممیز کیا تھا۔سائنس حقائق سے ،جب کہ شاعری حسیات اور جذبات سے متعلق ہوتی ہے۔شبلی بھی اسی خیال کو دہراتے ہیں۔جہاں تک مل کے اس تصور کہ 'شاعری تنہا نشینی اور مطالعہء نفس کا نام ہے' کا تعلق ہے،اسے شیلے نے واضح کیا تھا۔شیلے نے شاعری کو الہام کے بجائے تخلیق کہا۔"شاعر تخلیق کرتا ہے،لیکن اس کی تخلیق ،اس کا واہمہ نہیں ہے۔شاعری ان ہیئتوں کو پیش کرتی ہے،جو آفاقی فطرت اور وجود میں مشترک ہیں،اور نظم اس زندگی کی مکمل تمثال ہے جو ابدی صداقت میں ظاہر ہوتی ہے"۱۲۔اس طور شاعر کی تنہا نشینی کا جواز پیدا ہو جاتا ہے؛ وہ خلوت میں نفسِ خود پر مرکوز ہو کر نفسِ انسانی اور ماہیت وجود تک رسائی حاصل کرتا ہے۔یعنی نفسِ خود میں نفسِ انسانی مضمر ہے؛ذاتِ خود کا عرفان ،ذاتِ انسانی کا عرفان ہے۔یعنی 'ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو'۔لہٰذا شاعر جب خود کو مخاطب کرتا ہے تو دوسروں سے لاتعلق نہیں ہو جاتا۔

بایں ہمہ یہ سوال باقی رہتا ہے کہ کیا شاعر نفسِ خود میں نفسِ اجتماعی کو دریافت کرتا ہے، یعنی ایک بڑی حقیقت جو روزمرہ کے محدود شعور کی وجہ سے نظروں سے اوجھل تھی، اسے شعری مراقبے کے ذریعے دریافت کرتا ہے ،یا وہ شاعری کی صورت ایک ایسی ہیئت خلق کرتا ہے،جس میں نفسِ اجتماعی رونما ہو سکتا ہے؟ اگر ہم رومانوی فلسفے کو دیکھیں تو دوسری بات درست نظر آتی ہے ۔رومانوی نقادوں نے تخیل کو غیر معمولی اہمیت دی تھی ۔اس سے پہلے کلاسیکی تنقید یونانیوں کے نظریہء نقل پر انحصار کرتی تھی ۔نظریہء نقل یہ باور کراتا ہے کہ نفسِ خود میں نفسِ اجتماعی ہوتا ہے، شاعر بس یہ کرتا ہے کہ اس پر پڑی گرد جھاڑتا ہے،اور اس کی نقل کر تیار کر کے ،اسے ظاہر کر دیتا ہے ۔ دوسری

طرف تخیل 'دریافت' کے بجائے 'تخلیق' کرتا ہے، اور تخلیق کو انسانی عمل سمجھتا ہے، نہ کہ الہام۔ تخیل نئی ہیئتیں خلق کرتا ہے۔ مبادا غلط فہمی پیدا ہو، یہاں ہمیں داخلی اور خارجی ہیئت میں فرق کرنا چاہیے۔ خارجی ہیئت (جیسے غزل، مثنوی، نظمِ معریٰ و آزاد نظم) ایک ثقافتی اور اجتماعی شے ہے، جب کہ داخلی ہیئت انفرادی شے ہے۔ داخلی ہیئت کا تعلق کسی خیال یا تجربے کو کسی خاص ترتیب، یا بے ترتیبی، کسی خاص استدلال، یا بغیر استدلال سے پیش کرنے سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں داخلی ہیئتیں میکانکی نہیں ہوتیں (خارجی ہیئتیں بالآخر میکانکی ہو جاتی ہیں)؛ یہ نئے خیالات، نئے مطالب کے اظہار سے ایک نامیاتی رشتہ رکھتی ہیں؛ یعنی ہر نیا خیال، اپنی ہیئت، اپنا اسلوب اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب ہم کسی شعر یا نظم کے خیال کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں تو اسے اس کی ہیئت سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ چناں چہ جسے نفس اجتماعی کہا گیا ہے، وہ نئی شعری ہیئت کا مرہون ہے؛ اسے دریافت نہیں کیا جاتا، خلق کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں شاعر دیگر انسانوں سے اپنا رشتہ دریافت نہیں کرتا، اپنی غیر معمولی تخلیقی قوت، یا 'داخلی اور موضوعی غور و فکر' کی مدد سے نیا رشتہ خلق کرتا ہے۔ شبلی کو اوّل رومانوی شاعر کا یہ تصور اپنی روایت کے لیے اجنبی لگا؛ غالباً شبلی نے یہ سمجھا کہ جس شاعر کا مخاطب خود اس کا نفس ہے، وہ ضرور باقی سب سے لاتعلق ہے، جب کہ فارسی و اردو شاعری میں انھیں اپنے ہم نفسوں سے لاتعلقی کا تصور ہی محال لگا۔ مگر بعد میں شبلی نے 'تنہا نشینی' اور 'مطالعہءِ نفس' کے مضمرات سے آگاہ ہو کر انھیں قبول کر لیا۔

یہاں اصل مسئلہ شاعر سے زیادہ موضوعِ انسانی (Human Subject) کے تصور کا تھا۔ رومانوی شاعری میں موضوعِ انسانی خود مختار ہے اور لا زماں ہے، آفاقی ہے، ہر جگہ اور ہر لمحہ موجود ہے۔ یہ The Asolute Self اور The World Soul ہے۔ ایک طرح سے یہ، ذاتِ مطلق کی مترادف اور مقابل ہے۔ رومانویت نے موضوعِ انسانی کو عظمت، شکوہ اور تمام ممکنہ اوصاف سے متصف کیا؛ اسے دیگر موجودات کی طرح دنیا کا ایک مقصد قرار نہیں دیا، بلکہ اسے دنیا کا خالق کہا۔ اس میں وہی اعتمادِ ذات ہے جسے اقبال نے 'تو شب آفریدی، چراغ آفریدم رسفال آفریدی، ایاغ آفریدم' میں پیش کیا ہے۔ دنیا کو موضوعِ انسانی معرضِ فہم میں لا کر گویا اسے تخلیق کرتی ہے؛ اسے دسترس میں لا کر تسخیر کرتی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر دل چسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ شبلی کے زمانے تک موضوعِ انسانی کے اس تصور کو توسیع پسند یورپی ممالک نے سیاسی ہتھیار کے طور پر بھی استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ یہ دلیل قائم کرنے لگے تھے کہ خود مختار ذات اگر فطرت تسخیر کر سکتی ہے تو دوسری قوموں کو کیوں نہیں؟ نیز موضوعِ انسانی کی آفاقیت کے تصور کو پھیلا کر یہ کہا گیا کہ جس طرح نفسِ انسان کی ساخت یکساں اور آفاقی ہے، اسی طرح دنیا میں اخلاقیات کا ایک نظام ہے (یورپ کی مڈل کلاس کی اخلاقیات)، حکومت کا ایک طریقہ (پارلیمانی بادشاہت) ہے، صرف ایک مذہب ہے، جس کی اساس عقیدے پر نہیں، عقلی دلائل پر ہے۔ گویا عقلیت دنیا کا واحد مذہب ہے[۱۳]۔ یورپی آفاقیت کا یہ تصور، دیگر، متبادل، مقامی تصورات پر حاوی ہونے کی کوشش کرتا تھا؛ انھیں بے دخل کرتا تھا یا ان کی اصلاح کرتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی میں فلسفیانہ دانش، عملی سیاسی مزاج اختیار کر چکی تھی۔ شبلی جس علمی و ثقافتی فضا میں تنقید لکھ رہے تھے، اس میں کوئی علم، کوئی فن غیر سماجی و غیر

افادی نہیں رہا تھا؛ اور علم وفن کے سماجی ہونے کا مطلب فقط سماج کی ترجمانی یا خدمت نہیں تھا، بلکہ ان کی ماہیت ،ان کے اجزا، ان کے مندرجات ،ان کے دلائل 'سماجی' سمجھے جانے لگے تھے؛ کوئی شے سماج یعنی انسانی دنیا سے 'باہر' نہیں سمجھی جانے لگی تھی۔ اس عہد میں تاریخ سے غیر معمولی دل چسپی پیدا ہوگئی تھی ؛ اس دلچسپی کا گہرا تعلق علوم وفنون کی سماجیت سے تھا، کیوں کہ ہر علمی وتخیلی سرگری کی اصل وارتقا کا سراغ سماج کی تاریخ میں ملتا تھا۔

اس بات پر ایک بار پھر زور دینے کی ضرورت ہے کہ رومانوی شاعری کا نیم مابعد الطبیعیاتی تصور، سماجی تصور میں ڈھلنے لگا تھا۔ رومانوی The Asolute Self اور The World Soul ، اب The Social Absolute Soul میں بدلنے لگا تھا؛ وہ تنہا نشینی اور مطالعہ نفس کے دوران میں 'آفاقی انسانی روح' کو دریافت کرنے کے بجائے ،'اجتماعی سماجی روح' کو وضع کرنے کوشش کرتا تھا، جسے اس زمانے کی لغت میں قومی روح کہا گیا تھا۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ 'روح' کے غیر متغیر، مستقل ہونے کا تصور باقی رہا؛ یعنی یہ سمجھا جاتا رہا کہ آفاقی روح کی مانند اجتماعی سماجی ،یا قومی روح بھی مستقل ہونی چاہیے ؛ ایک سماج یا قوم کے افراد ایک روح کے حامل ہونے چاہییں ؛ شاعر کا کام اس روح کی ترجمانی ہے۔ اواخر انیسویں صدی کی اردو تنقید میں ہمیں قومی شاعری کا یہ تصور ملتا ہے۔ حالی کے یہاں قومی شاعری کا واضح تصور ملتا ہے ،جب کہ شبلی نے بالواسطہ طور پر قومی شاعری کا تصور پیش کیا ہے۔ شبلی شاعری پر آب وہوا، جغرافیہ، تمدنی حالات ،نیز مجموعی معاشرتی فکری صورتِ حال کے اثرات کو موضوع بناتے ہیں۔

شبلی کی تنقید کا مطالعہ کرتے ہوئے کوئی شخص یہ تاثر قائم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کے تنقیدی خیالات خاصے منتشر اور بعض مقامات پر خاصے سرسری ہیں ؛ نیز نظری تنقید میں جس منظم استدلال کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی سخت کمی بھی محسوس ہوتی ہے ؛ بایں ہمہ ان کے تنقیدی خیالات میں 'موضوع انسانی' کے اس مسئلے سے نبرد آزما ہونے کی کوشش ملتی ہے، جو ان کے زمانے میں ایک عبوری مرحلے سے گزر رہا تھا۔ اس کا قدیمی مابعد الطبیعیاتی رخ، مادی سماجی دھوپ میں جھلنے لگا تھا، اور نئے خدو خال اختیار کرنے لگا تھا۔ دوسرے لفظوں میں شبلی جب شاعری کو تنہا نشینی اور مطالعہ ء نفس قرار دیتے ہیں تو اپنی تنقیدی فکر کو ایک مرتبہ پھر دوجذبیت کے منطقے میں لے جاتے ہیں۔ قدیمی مابعد الطبیعیاتی تصور کی رو سے موضوع انسانی متحد (unified human subject) تھا، مگر اس کا سماجی تصور اسے منقسم سمجھنے پر اصرار کرتا تھا۔ 'متحد موضوع انسانی' یکساں، متجانس ،غیر مبدل ،واحد زاویہ ء نظر سے عبارت ہوتا ہے، اور زمان ومکاں سے عموماً غیر متاثر رہتا ہے ،جب کہ 'منقسم موضوع انسانی' میں غیر متجانس، تغیر پذیر اور کثیر زاویہ ہائے نظر ہوتے ہیں، اور ہر زاویہ ءنظر زمان ومکاں کا پابند ہوتا ہے۔ مثلاً ہماری قدیم داستانوں میں کردار اوّل تا آخر غیر مبدل رہتے ہیں، اور اپنی کرداری خصوصیات کو ہر طرح کی حالت اور ہر جگہ پر برقرار رکھتے ہیں۔ جیسے حاتم طائی اپنے شخصیت کے اخلاص واثیار کو ہر قسم کی مشکلات کے باوجود قائم رکھتا ہے ؛ اسی طرح کلاسیکی غزل کا محبوب اپنی جفا پسندی اور عاشق اپنی جاں نثاری پر حرف نہیں آنے دیتا۔ جدید فکشن اور جدید شاعری دونوں میں ہمیں اس نوع کے داخلی طور پر متحد، ناخطا پذیر کردار نہیں ملتے۔ موضوع انسانی کے اتحادِ داخلی پر پہلی چوٹ

رومانویت ہی نے لگائی۔ یہی وجہ ہے کہ موضوعِ انسانی کے رومانوی تصور میں ہمیں اس کے مابعد الطبیعیاتی اور سماجی رخ بہ یک وقت ملتے ہیں۔ مثلاً کالرج نے موضوعِ انسانی کی جگہ خود آگاہی (Self consciousness) کی ترکیب استعمال کی ہے۔ کالرج خود آگاہی کو 'ہستی' (Being) کی قسم نہیں سمجھتے، بلکہ 'فہم' (Knowing) کی قسم سمجھتے ہیں، اور جس سے بڑھ کر کوئی اعلیٰ ترین شے ہمارے لیے موجود نہیں۔ گویا کالرج کی نظر میں خود آگاہی سے ایک، واحد، نئی ہستی یا داخلی طور پر متحد شخصیت نمود نہیں کرتی، بلکہ فہم کے سلسلے، یا زاویہ ہائے نظر کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ ایک بڑے خطرے کی گھنٹی ہے۔ کالرج کی دلیل یہ ہے کہ چوں کہ ہم خود آگاہی میں مسلسل اندر دور تک یا پیچھے چلتے جاتے ہیں... تاکہ ہر آگہی کی بنیاد تلاش کرسکیں... اس لیے اس داخلی، ذہنی سفر سے ہمارا تعقل چکرا سکتا ہے، اور تعقل کا مقصد ختم ہوسکتا ہے، یعنی اتحاد اور نظم پارہ پارہ ہوسکتا ہے۔[۱۴]

یہاں پہنچ کر ہم اس بات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ شبلی نے شاعری کے لیے 'تنہا نشینی' اور 'مطالعۂ نفس' کا تصور یوں ہی روا روی میں نہیں اختیار کرلیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تنہا نشینی و مطالعۂ نفس دو دھاری تلوار کی طرح تھیں؛ ان سے اگر ایک طرف شاعر نفسِ اجتماعی سے اتحاد تشکیل (دریافت نہیں) دے سکتا تھا، تو دوسری طرف 'اتحاد و نظم' کو پارہ پارہ بھی کرسکتا تھا۔ اس میں ایک طرح کے نظم کو تشکیل دینے کی صلاحیت تھی تو دوسری طرف دوسری طرح کے نظم کو شکست دینے کی طاقت تھی۔ یعنی یہ 'نظم و اتحاد' کو اسی طرح 'بے مرکز' رکھنے پر قادر تھیں، اور ان کی کسی ایک شکل کے استبداد کو قائم ہونے سے روکنے کی اہل تھیں، جس طرح دو جذبیت!

اس بحث کو آگے بڑھانے کے لیے اب ہم شبلی کی دو اہم اصطلاحات کی طرف رجوع کر سکتے ہیں: تخیل اور محاکات۔ شبلی انھیں شاعری کے اصلی اجزا قرار دیتے ہیں۔ شبلی کی توجیہ کے مطابق تخیل اور محاکات باہم متضاد ہیں۔ شبلی کی نظر میں تخیل قوتِ اختراع ہے، جب کہ "محاکات کے معنی کسی چیز یا حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے"۔[۱۵] قوتِ اختراع خیالی و سیمیاوی اشیا کو ہمارے سامنے لاتی ہے، یا اس بات کی صلاحیت رکھتی ہے، جب کہ محاکات حقیقی اور موجود اشیا ہی کو ہمارے روبرو لاتی ہے۔ تخیل کا میدان ماورائے حس دنیا تک پھیلا ہوا ہے، یعنی اس دنیا تک جہاں آزادی کا انتہائی حد تک تصور کیا جاسکتا ہے، مگر محاکات کا دائرہ حسی دنیا تک محدود ہے، یعنی اس دنیا تک جہاں قدم قدم پر بندشیں ہیں؛ یعنی شاعری کی دنیا دو متضاد دنیاؤں، دو انتہاؤں سے عبارت ہے۔ شبلی کو بھی اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ وہ شاعری کا مدار دو متضاد عناصر پر رکھ رہے ہیں۔ وہ اس تضاد کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور یہیں سے شبلی کی تنقید میں ایک بڑی گڑ بڑ پیدا ہوتی ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ اب شبلی بھول چکے ہیں کہ انھوں نے شاعری کو تنہا نشینی اور مطالعۂ نفس قرار دیا تھا، مگر یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ مطالعۂ نفس میں 'نظم و اتحاد' کو تشکیل دینے والی خصوصیت تو ان کی نظر میں ہے، جب کہ 'نظم و اتحاد' کو شکست دینے والی صلاحیت انھوں نے نظر انداز کردی ہے۔ بہ ہر کیف وہ مذکورہ تضاد کو حل کرنے لیے شعری تخیل اور فلسفیانہ تعقل میں مطابقت کا قدیم تصور دوہراتے ہیں۔ تضاد کو گرفت میں لینے کی مشکل، صبر آزما، مگر تخلیقِ معنی کی زرخیز صورت کے بجائے مطابقت کی سہل، واحد و متعین معنی کی حامل صورت کو کام میں لاتے ہیں؛ صاف لفظوں میں

دو جذبیت سے باہر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ عبارت دیکھیے

> یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ تخیل صرف خیالی اور سیمیاوی صورتوں کا نام ہے، جو جذبات کے طاری ہونے کے وقت نظر آتی ہیں۔تخیل نے اکثر وہ راز کھولے ہیں جو نہ صرف عوام بلکہ خواص کی نظر سے بھی مخفی تھے۔وقت آفرینی اور حقیقت سنجی جو فلسفہ کی بنیاد ہے ،تخیل ہی کا کام ہے۔اسی بنا پر شاعری اور فلسفہ دو برابر کی چیزیں تسلیم کی گئی ہیں۱۶۔

شبلی یہ مانتے ہیں کہ تخیل سیمیاوی اور خیالی صورتوں کو خلق کر سکتا ہے،یعنی تخیل ناموجود کو موجود بنا سکتا ہے، یا خیالی و سیمیاوی صورتوں پر حقیقی صورتوں کا قوی گمان پیدا کر سکتا ہے۔ذرار کیے :دیکھیے ،آخر سیمیا کیا ہے،جس سے شبلی حالی کی طرح اس قدر خوف زدہ ہیں ؟سیمیا موہوم کو موجود بنانے کے ساتھ ساتھ ،ایک طلسم بھی ہے جس کے ذریعے روح کو ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل کیا جا سکتا ہے؛یہ ایک دھوکہ ہے،ایک مکر ،ایک چال ہے،مگر یہ وہی مکر اور چال ہے جو استعارے کے پرانے تصور کی اصل ہے؛ استعارے میں کسی لفظ کا معنی [روح] ،کسی دوسرے لفظ کی طرف منتقل کیا جاتا ہے،حالاں کہ وہ لفظ اس معنی کے لیے نہیں بنا تھا۔انتقالِ معنی کا یہ عمل سیمیا ہے،جس سے اسرار کھلتے اور نئے معانی پیدا ہوتے ہیں۔لہٰذا حسن عسکری نے بالکل بجا طور پر حالی (وشبلی) کو استعارے سے خوف زدہ قرار دیا تھا۔عسکری صاحب کی نظر میں ''استعارے کا خوف اصل میں غیر عقلی تجربات کا خوف ہے''۱۷۔عسکری نے حالی وشبلی کی نسل کے یہاں استعارے کے جس خوف کا ذکر کیا ہے،اس کا خیال انھیں فرائیڈی نفسیات سے آیا ہے ۔اس بنا پر انھوں نے صرف غیر عقلی یعنی جبلی ،لاشعوری تجربات سے حالی کے ڈر کا ذکر کیا ہے۔حالاں کہ شبلی و حالی کا ڈر غیر عقلی تجربات کے علاوہ، مادرائے عقلی ،مادرائے حسی دنیاؤں کا ڈر بھی تھا؛اپنی ذات کے اس منطقے میں داخل ہونے کا ڈر بھی تھا،جہاں دنیا ، وجود ،ہستی کے موجود نظم کو پارہ پارہ کیا جا سکتا ہے ،یا ایک ایسے نظم کو وجود میں لایا جا سکتا ہے ،جس کا مماثل پہلے موجود ہی نہ ہو، یا پھر سرے سے بے نظمی کا کھیل کھیلا جا سکتا ہے؛اپنی موضوعیت کے بحرِ بے کنار میں اترا جا سکتا ہے،اور معروضی دنیا کے استبداد سے بچا جا سکتا ہے ،یا اس استبداد کے مقابلے کی ایک نئی حکمت عملی وضع کی جا سکتی ہے ۔ حالی نے اپنے ڈر پر قابو پانے کے لیے قوت متخیلہ پر قوتِ ممیزہ کا پہرہ بٹھا دیا تھا،اور شبلی تخیل کے پر قطع کر کے ،اسے فلسفے کے تعقل کی سطح پر لے آتے ہیں۔

شبلی شعری تخیل و فلسفیانہ تعقل میں مطابقت کی مثال میں ہومر کی شاعری لاتے ہیں ،اور کہتے ہیں کہ ارسطو نے اپنی کتاب المنطق میں شاعری کے جو علمی اصول منضبط کیے ،اس کے کلام سے کیے ہیں۔شبلی فرانسیسی گیزد کی یہ مبالغہ آمیز رائے بھی پیش کرتے ہیں کہ '' اس [ہومر] کے کلام میں ہر اصل کی اصل اور انسان اور عالمِ کائنات کی حقیقت مندرج ہے''۱۸۔در اصل شبلی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ شعری تخیل اور فلسفیانہ تعقل میں مشترک بات یہ ہے کہ دونوں اشیا اور وجود کی غیر مبدل اصل تک پہنچتے ہیں۔یہاں پہنچ کر شبلی تخیل اور محاکات میں بھی مطابقت قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کی رائے کے مطابق تخیل بھی وہی کام کرتا ہے ،جو محاکات کرتی ہے: یعنی اصل کو مجسم کرنا۔اس فرق کے ساتھ کہ محاکات حسی دنیا کی اصل کو سامنے لاتی ہے ،اور تخیل ذہنی دنیا کی اصل کو۔شبلی یہاں

ارسطوئی فکر سے استفادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دونوں 'اصل' کی تصدیق اس انبساط سے ہوتی ہے جس کا تجربہ قاری کرتا ہے۔ انبساط کا یہ تجربہ کسی نئی شے کے کشف، یا کسی معلوم شے کے اجنبی گوشے کے انکشاف کا تجربہ نہیں، موجود کی تصدیق وشناخت کا تجربہ ہے۔ شبلی ارسطو کی تقلید میں چھپکلی کی مثال پیش کرتے ہیں۔ ''چھپکلی ایک بد صورت جانور ہے، جس کو دیکھ کر نفرت ہوتی ہے، لیکن اگر ایک استاد مصور چھپکلی کی ایسی تصویر کھینچ دے کہ بال برابر فرق نہ ہو تو اس کے دیکھنے سے خواہ مخواہ لطف آئے گا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ نقل کا اصل کے مطابق ہونا خود ایک مؤثر چیز ہے''۱۹۔ یہ لطف اصل چھپکلی کی تصدیق وشناخت پر منحصر ہے۔ اس طرح شبلی ارسطو کی تقلید میں جمالیاتی انبساط کو محدود کر دیتے ہیں۔ اصل چھپکلی در اصل چھپکلی کے مشاہدے کی، یعنی اس کے حسی علم کی یادداشت ہے۔ چھپکلی کی تصویر کے اصل کے مطابق ہونے کا یہی مفہوم ہے کہ وہ اس یادداشت کو مجسم کردے۔ اس طرح نقل کا اصل کے مطابق ہونا، ہمارے علم میں اضافہ نہیں کرتا، ہمارے موجود علم کو مستحکم کرتا ہے، مماثلت وتصدیق وشناخت کی مدد سے۔ دوسرے لفظوں میں نظریۂ نقل مشابہت کی جمالیات تک محدود رہتا ہے، اور استعارے کی جمالیات سے دور اور ہراساں! لہٰذا یہ اتفاق نہیں کہ شبلی محاکات اور تخیل دونوں کی بے اعتدالی سے خبردار کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شبلی کی نظر میں تعقل اور تخیل، دونوں کی 'بے اعتدالی' کا مفہوم اور نتائج یکساں ہیں؛ دونوں اصل و ماخذ سے دور جا پڑتے ہیں۔

> طبعیات کے متعلق جس طرح یونانی حکما کی قوتیں بیکار گئیں اور آج تک ان کے پیرو ہیولا اور صورت کی فضول بحثوں میں الجھ کر کائنات کا ایک عقدہ بھی حل نہ کر سکے، بعینہٖ ہمارے متاخرین شعرا کا بھی یہی حال ہوا۲۰۔

فارسی و اردو کے متاخرین شعرا اس لحاظ سے مظلوم ہیں کہ انھیں آزاد، حالی اور شبلی تینوں نے تخیل کی بے اعتدالی کا طعنہ دے کر خوب کوسا ہے۔ تعقل کی بے اعتدالی کا مظہر اگر ہیولا اور صورت ہے تو تخیل کی بے اعتدالی ہیولائی نوعیت کی تشبیہات واستعارات ہیں۔

> تخیل کی بے اعتدالی کا بڑا موقع استعارات اور تشبیہات ہیں۔ استعارے اور تشبیہیں جب تک لطیف، قریب الماخذ اور اصلیت سے ملتی جلتی ہوتی ہیں، شاعری میں حسن پیدا کرتی ہیں، لیکن جب تخیل کو بے اعتدالی کا موقع ملتا ہے تو وہ دور از کار اور فرضی استعارات اور تشبیہیں پیدا کرتی ہے، پھر اس پر اور بنیادیں قائم کرتی جاتی ہیں۲۱۔

اصلیت کا لفظ تو کم وبیش اسی مفہوم میں حالی بھی استعال کر چکے ہیں، مگر 'قریب الماخذ' کی ترکیب شبلی کے مدعا کو زیادہ وضاحت سے پیش کر رہی ہے۔ شبلی نے تشبیہ اور استعارے میں زیادہ فرق نہیں کیا؛ وہ دونوں کے قریب الماخذ یا اصلیت کے قریب ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔ شبلی کی مجموعی تنقیدی فکر دیکھیں تو اس میں تشبیہ کی خاصی گنجائش ہے، استعارے کی نہیں۔ شبلی کو تشبیہ اور استعارے کے 'قریب الماخذ' ہونے پر اس لیے اصرار ہے کہ ایک طرف اس سے تخیل کی بے اعتدالی سے بچا جا سکتا ہے، اور دوسری طرف اس سے موضوع انسانی کے متحد رہنے کا امکان پیدا ہو سکتا

ہے۔تخیل کی بے اعتدالی،خیالی اور سیمیادی دنیا میں لے جاتی ہے،جہاں شعورِ نفس کی وحدت کے منتشر ہونے یا کثیر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے؛شاعر اپنے وجود اور شعورِ وجود کے واحد مرکزی نکتے سے دور جا سکتا ہے۔

تشبیہ کا ماخذ شے نہیں،مشابہت ہے؛گل کی تشبیہ کا ماخذ محبوب نہیں (محرک ضرور ہے)،دونوں میں جمال ونزاکت کی مشابہت ہے؛تشبیہ کا اکھوا اسی مشابہت سے پھوٹتا ہے۔مشابہت کی دریافت،انفرادی کوشش کا نتیجہ ہو سکتی ہے،مگر خود مشابہت دو مختلف اشیا میں ایک ایسا اشتراک ہے جس کی تصدیق عموی،اجتماعی تجربے سے کی جا سکتی ہو۔اس طور تشبیہ ہمیں باہم مجتمع کرتی ہے۔ہم تشبیہ کے ذریعے اپنے وجود اور معرفتِ وجود کے منتشر اجزا کو منظم کرتے ہیں؛اپنی موضوعیت کو متحد الاصل بناتے ہیں،مگر واضح رہے کہ یہ 'اصل' اجتماعی،سماجی ہے،انفرادی نہیں؛اس میں فرد کی اس ذاتی،لاشعوری اصل خارج رکھی جاتی ہے،جو اکثر شعوری تشکیلات کو تہ وبالا کر سکتی ہے۔لہٰذا تشبیہ قوی،سماجی شاعری کے لیے ناگزیر ہے۔دوسری طرف 'دور از کار تشبیہ' وہ ہے،جس میں موجود مشابہت عموی اجتماعی تجربے کی حدود سے باہر ہوتی ہے؛یعنی وہ عقلی و قیاسی ہوتی ہے۔لہٰذا دور از کار تشبیہیں ہمارے وجود اور ہماری معرفتِ وجود کی مانوسیت کو لخت لخت کرتی ہیں۔یہ ہمیں وجود کی اجتماعی اساس کے بجائے انفرادی،خیالی،واہماتی دنیا میں لے جاتی ہیں۔خیالی اور واہماتی دنیا،موضوعِ انسانی کو نہ صرف متحد نہیں رہنے دیتی،بلکہ اسے 'بے مرکز'یعنی decentre بھی کرتی ہے۔شبلی وحالی کے یہاں اس خیالی اور واہماتی دنیا کا دوسرا نام مبالغہ ہے۔بہ قول شبلی''متاخرین نے جو دراصل شاعر نہ تھے،بہ قصد وارادہ اپنے احساس کو قوی تر بنانا چاہا،اور چوں کہ اس کا ان کو تجربہ نہ تھا،اس لیے کہیں سے کہیں نکل گئے''۲۲۔گویا مبالغہ شاعر کو تجربے کی دنیا سے باہر،کہیں سے کہیں لے جاتا ہے۔تجربہ شاعر کے وجود کا 'مرکز' ہے،جسے خیال اور واہمہ 'بے مرکز' کرتا ہے۔

اس مسئلے کو ہم لفظ ومعنی کی بحث سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔یہ بحث بھی شبلی اٹھاتے ہیں۔اس ضمن میں شبلی ابن رشیق کی کتاب العمدہ کے باب فی اللفظ والمعنی سے اقتباس پیش کرتے ہیں،جس میں لفظ ومعنی کے ارتباط کو روح اور جسم کے ارتباط کی مانند سمجھا گیا ہے؛روح اور جسم میں ہمویت ہے؛روح بغیر جسم کے ہو سکتی ہے،اور جسم روح کے ہوتے ہوئے عیب کا حامل ہو سکتا ہے۔اسی مقام پر شبلی اہل فن کے دو گروہوں کا ذکر کرتے ہیں۔ایک لفظ کو ترجیح دیتا ہے (عرب کا اصلی انداز یہی ہے)؛دوسرا مضمون کو ترجیح دیتا ہے،اور الفاظ کی پروا نہیں کرتا۔شبلی پہلے گروہ کے حامی ہیں۔صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ''حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے''۲۳۔لفظ ومعنی کی یہ بحث دراصل مراتب کی بحث ہے۔یعنی اگر ہمویت ہے تو ایک کو لازماً دوسرے پر فوقیت ہے۔شبلی کو اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ مراتب کی یہ بحث خاصی نازک،اور گہرے مضمرات کی حامل ہے۔یہ بات شبلی کی نظر سے اوجھل نہیں کہ لفظ ومعنی کے نظامِ مراتب میں،جب لفظ کو فوقیت دی جائے تو لفظ کو معنی کے درجے معنی کی حیثیت،معنی کے حدود،معنی کے حسن و قبح،معنی کی آزادانہ حرکت کو طے یا محدود کرنے کا اختیار بھی دیا جا رہا ہوتا ہے؛ذہنی دنیا کے درجات کے تعین کا استحقاق،مادی،حسی دنیا کے سپرد کیا جا رہا ہوتا ہے؛سگنی فائیڈ پر سگنی فائر کو حکم بنایا جا رہا ہوتا ہے؛مضمون پر لفظ کو ترجیح دی جا رہی ہوتی ہے۔یہاں شبلی کو دوسرے گروہ کے ایک ممکنہ اعتراض کا

خیال آتا ہے: ''شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ الفاظ کا اثر بھی معنی ہی کی وجہ سے ہوتا ہے، یعنی ایک لفظ اسی بنا پر پُر عظمت ہوتا ہے کہ اس کے معنی میں عظمت ہوتی ہے''۲۴۔ اس اعتراض کی مزید وضاحت اور اس کے جواب میں نظامی کا یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

ور آن وجلہ ء خون بلند آفتاب
چو نیلو فر افگند زورق بر آب

اس شعر میں اگر چہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر دجلہ کے بجائے چشمہ اور زورق کے بجائے کشتی کر دیا جائے تو گو معنی وہی رہیں گے، لیکن شعر کم رتبہ ہو جائے گا... یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے، لیکن اولاً تو بہت سے لفظ ایسے ہیں، جن کے معنی میں نہیں، بلکہ صورت اور آواز میں رفعت اور شان ہوتی ہے... اس کے علاوہ اس قسم کے الفاظ میں لفظی حیثیت اس قدر غالب آ گئی ہے کہ گو وہ رفعت معنی ہی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، تاہم سامع یہی سمجھتا ہے کہ یہ لفظ ہی کا اثر ہے، اس لیے ایسے الفاظ کا اثر الفاظ ہی کی طرف منسوب کرنا چاہیے۲۵۔

اس اقتباس پر غور کریں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شبلی لفظ و معنی کے مراتب کی بحث میں لفظ کو اولیت دیتے ہیں، اور معنی کو ثانوی حیثیت۔ لفظ کو اہمیت دینے سے توجہ خود بہ خود لفظ کے فصیح، غیر فصیح، مانوس، غریب ہونے، یا بلاغت کے دیگر اصولوں کی پاس داری، عدم پاس داری کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ شبلی کے موازنہ انیس و دبیر کو بھی اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ ایک دوسرے زاویے سے یہاں شبلی کی فکر کا رشتہ 'زبانی روایت' سے بھی قائم ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ زبانی روایت کا انحصار لفظ و کلام اور متکلم کے استناد پر ہے۔ شبلی، الفاظ کی آواز میں جس رفعت اور شان کا ذکر کرتے ہیں، اسے متکلم ممکن بناتا ہے، اور سامع اس کا ادراک کرتا ہے۔ شبلی جب کہتے ہیں کہ 'سامع یہی سمجھتا ہے کہ یہ لفظ کا اثر ہے' تو وہ الفاظ کی آواز کے اثر کی بات کر رہے ہیں؛ الفاظ کے معنی کی نہیں۔ لہٰذا 'زبانی روایت' لفظ و متکلم و سامع کے اتحاد پر زور دیتی ہے۔ ژاک دریدا اسے تحریر پر تقریر کی فوقیت کہہ کر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ دریدا کے مطابق یہ 'موجودگی کی مابعد الطبیعیات' ہے جو مغربی فلسفے میں افلاطون سے اب تک چلی آتی ہے۲۶۔ سادہ ترین لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ متکلم کی موجودگی، کلام کے معنی کا مرکز ہے۔ یعنی خود لفظ اور اس کے جدلیاتی رشتے معنی پیدا نہیں کرتے، بلکہ متکلم کی موجودگی مطلق طور پر معنی کے عمل پر حاوی ہوتی ہے۔ شبلی کی تنقیدی فکر کا میلان 'موجودگی کی مابعد الطبیعیات' کی طرف ہے۔ آل احمد سرور نے حالی و شبلی کی سوانح نگاری کے موازنے میں ایک دل چسپ نکتہ ابھارا ہے: ''حالی کے نزدیک شخص اہم ہی نہیں تھا... شبلی اس لحاظ سے زیادہ شخص پرست تھے''۲۷۔

شبلی معنی و مضمون پر الفاظ کو اس لیے بھی فوقیت دیتے ہیں کہ لفظ مستحکم (stable) ہے، جب کہ معنی غیر مستحکم (unstable) ہے اور سیال ہے۔ لفظ قریب الماخذ تشبیہ کی مانند ہے، اور معنی دور از کار تشبیہ کی طرح ہے۔ لفظ پر گرفت قائم رکھنا ممکن ہے، معنی پر نہیں۔ لفظ: واقعیت و اصلیت ہے، اور معنی: مبالغہ، واہمہ اور قیاسی ہے۔ شبلی

لفظ کی اصلیت کی مدد سے معنی کی واہماتی دنیا کو قابو میں رکھنا چاہتے ہیں۔یہ عمل قوت متخیلہ پر قوت ممیزہ کا پہرہ بٹھانے کے مترادف ہے، اور شبلی کے منشا کے مطابق تخیل کو معلومات و مشاہدات و موجودات سے منسلک کرنا ہے۔ شبلی جب یہ کہتے ہیں کہ 'کوئی خیال مشاہدات اور واقعات کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا' تو ایک بنیادی حقیقت کا اظہار کرتے ہیں، مگر ایک مشاہدہ کتنے خیالات، مختلف خیالات، متبائن خیالات کو 'پیدا' کرسکتا ہے؛ ایک ہی معروض کے دیکھنے کے کتنے تناظرات ہوسکتے ہیں، اسے شبلی اپنی تنقیدی فکر میں جگہ دینے پر تیار نظر نہیں آتے۔مشاہدہ خیال کو پیدا کرتا ہے، بالکل بجا، مگر جب خیال پیدا ہوجاتا ہے، زبان کے نظام میں داخل ہوجاتا ہے، یعنی معرض اظہار میں آجاتا ہے تو خیال کی دنیا پر مشاہدے کی حکمرانی نہیں ہوتی۔غور کیجیے: یہاں شبلی شاعری کی پہلی تعریف ''تنہا نشینی اور مطالعہ ءنفس'' سے کس قدر دور چلے گئے ہیں۔شبلی مشاہدے اور خیال میں، یا لفظ اور معنی میں براہِ راست اور یکساں نوعیت کے رشتے کا تصور پیش کرتے ہیں؛ وہ زبان کو باہر کی حقیقت کا سیدھا سادہ عکس سمجھتے محسوس ہوتے ہیں۔اس لیے فرماتے ہیں کہ تخیل کی وسعت، مشاہدات کی کثرت کی مرہون ہے؛ گویا تخیل قدم قدم پر مشاہدات کی دنیا کا دست نگر ہے؛ تخیل تخلیق نہیں کرتا، منعکس کرتا ہے؛ تخیل کا رخ اندر کی جانب نہیں، باہر کی طرف ہے۔صاف لفظوں میں شاعری کے معانی کا سرچشمہ مشاہدات کی دنیا، باہر کی حسی، خارجی دنیا ہے۔اسی ضمن میں شبلی گھوڑے کی تیز رفتاری کے لیے 'دریاے آتش' کی تشبیہ کا ذکر کرتے ہیں، جو ایک خیالی معنی ہے، مگر یہ دریا اور آتش جیسی حقیقی اشیا کے مشاہدے سے پیدا ہوئی ہے۔ یہاں کچھ بنیادی باتیں نظر انداز ہوئی ہیں۔ مشاہدے، واقعیت، اصلیت پر زور دیتے ہوئے، یہ بات نظروں سے اوجھل رہتی ہے کہ آخر تشبیہ اور خصوصاً استعارہ پیدا کیسے ہوتا ہے؟ شبلی و حالی شاعری کا ایک سادہ نسخہ پیش کرتے ہیں: زیادہ سے زیادہ حقیقی چیزوں پر دھیان دو، اور قریب الماخذ استعارے پیدا ہوتے جائیں گے۔ اس زمانے میں 'دور از کار تشبیہ و استعارہ' موجب عتاب تھے، اور شاید اس لیے کہ ایک قدیم تصور کے اسیر تھے۔خود شبلی نے تشبیہ و استعارہ کی جو تعریفیں درج کی ہیں، وہ بیان و بلاغت کی پرانی کتابوں کے مباحث کی سلیس صورت ہیں۔شبلی تشبیہ کے لیے 'وہ شخص شیر کی مثل ہے' اور استعارے کے لیے 'وہ شخص شیر ہے' کی مثال پیش کرتے ہیں۔تشبیہ و استعارہ کی اس وضاحت کے بعد، شبلی نے سارا زور ان کی جدت، ندرت اور لطافت پر دیا ہے۔شبلی کی ان بحثوں کا حاصل یہ ہے کہ تشبیہ و استعارہ اسی وقت تازہ، اچھوتا اور نادر ہوسکتا ہے، جب وہ 'قریب الماخذ' ہو۔انھوں نے فارسی اور عربی کے اشعار درج کر کے یہ واضح کرنے کی کوشش بھی کی ہے کہ ان اشعار کا حسن، قریب الماخذ تشبیہات و استعارات میں مضمر ہے۔ مثلاً نظیری کا یہ شعر درج کرتے ہیں:

همه شب بر لب و رخسار و گیسو میزنم بوسه
گل و نسرین و سنبل را صبا در خرمن ست امشب

یعنی 'میں معشوق کے لب اور رخسار اور گیسو کو تمام رات چومتا رہا۔آج گل و نسرین و سنبل کے خرمن میں ہوا گھس آئی ہے۔ چوں کہ بوسے کی وجہ سے گیسو بکھرتے رہے، لب و رخسار کا رنگ بدلتا رہا، اس لیے یہ کیفیت گل و نسرین و سنبل کے خرمن میں صبا کے در آنے کی مثل تھا۔شبلی کا سارا زور اس بات پر ہے کہ استعارے باہر موجود ہیں۔ چناں چہ وہ

مثال میں جتنے اشعار پیش کرتے ہیں، ان میں خارجی دنیا کی ان اشیا کا ذکر کرتے ہیں جنھیں تشبیہ اور استعارہ بنایا جاتا ہے۔تشبیہ و استعارہ کی یہ ضاحت خاصی میکانکی ہے ،اور اس کی روشنی میں اشعار کا مطالعہ محض واہ ، سبحان اللہ جیسے تاثر کا اظہار ہے۔استعارہ کس طرح ایک منطقے سے دوسرے مختلف ،منطقے میں معنی کو منتقل کرتا ہے،اور اسی دورا ن میں کس طرح معنی کی قلبِ ماہیت ہوجاتی ہے ،اس جانب شبلی کی تنقید ہماری راہنمائی نہیں کرتی۔مثلاً نظیری کے مندرجہ بالاشعر میں صرف وصل کی کیفیت کا بیان نہیں، بلکہ استعارے کی مدد سے اس کیفیت میں نئے معانی بھی پیدا ہوئے ہیں؛ 'معشوق کے لب ورخسار وگیسو کے تمام رات بوسے لینا' ایک معنی ہے ،جب اس معنی کو شاعر نے 'گل و نسرین و سنبل میں صبا کے در آنے' کی تمثال کے ذریعے بیان کیا تو صرف پہلا معنی ایک دوسرے ذریعے سے منتقل نہیں ہوا بلکہ پہلے معنی کی قلبِ ماہیت بھی ہوئی؛ وصال کی حالت کے نازک ،گریز پا، انتہائی نجی لمحات کا معنوی رشتہ فطرت کے اس عمل سے قائم ہوگیا جو ہمارے اجتماعی مشاہدے کا حصہ ہے ؛نجی لمحے کی خاموشی و اخفا کو خارجی فطری مظہرِ حسن نے زبان دی۔ حقیقتاً دو مختلف منطقوں کی مدد سے ایک نئی خیالی دنیا پیدا ہوئی؛ یہ دنیا باہر کا عکس نہیں، بلکہ استعاراتی بیان کے ذریعے پیدا ہوئی ہے ،اور اسی کے اندر وجود رکھتی ہے ،لہٰذا اس کے معانی کے لیے ہم اصولی طور پر استعاراتی منطق کی طرف ہی رجوع کریں گے ؛یعنی اسی واہماتی دنیا میں داخل ہوں گے، جس سے شبلی وحالی ڈرتے ہیں۔دل چسپ بات یہ ہے کہ شبلی ایسے کئی اشعار درج کرتے ہیں ،جن میں لاشعوری ،جبلی، غیر عقلی ،ورائے عقلی تجربات ظاہر ہوئے ہیں، مگر شبلی ان کی تفہیم میں ساری توجہ لفظ، سگنی فائر یعنی مستحکم پہلوؤں کو دیتے ہیں۔

بھلے شبلی کی نظر میں معنی کی دنیا مبالغے اور واہمے سے عبارت ہے، مگر وہ اس دنیا کی قوت اور کارکردگی سے واقف ہیں۔یہ حقیقت شبلی کی نظر سے اوجھل نہیں کہ ایک طرف معنی تخیلی ،خیالی ،لاشعوری دنیا سے تعلق رکھتا ہے(جس کی وضاحت سے ان کی تنقید گریز کرتی ہے)،تو دوسری طرف معنی کی ایک دوسری دنیا بھی ہے، جو حقیقت میں 'سماجی تشکیل' ہے؛ چوں کہ سماجی تشکیل ہے ،اس لیے سماج کی مقتدر قوتوں کی آماج گاہ بھی ہے۔چوں کہ معنی سماجی قوتوں کی آماج گاہ ہے،اس لیے مقتدر ادارے اسے آئیڈیالوجی کی تشکیل میں بھی بروئے کار لاتے ہیں۔سماجی قوتوں کی ساری جنگیں معنی کی دنیا میں برپا ہوتی ہیں۔اقتداری قوت کے وضع کردہ یا اس کی حمایت میں وضع کردہ معانی ،سماج کی عمومی علمی فضا اور بسا اوقات شعری تخیل میں سرایت کر جاتے ہیں۔ معانی جب ایجاد یا وضع ہوتے ہیں تو ایک مقام پر رک نہیں جاتے ،ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف، ایک طبقے سے دوسرے طبقے کی جانب اور ایک سماجی گروہ سے دوسرے سماجی گروہ کی سمت سفر کرتے ہیں۔معنی ایک سیل ہے جس پر بند نہیں باندھا جا سکتا؛وہ آگے ، اِدھر، اُدھر، اِس جانب ،اُس طرف بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔اپنی اس خصوصیت کی بنا پر معنی، موضوع انسانی کو 'بے مرکز' کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے؛یعنی 'میں' یا 'ہم' سماج میں موجود معانی کے کھیل کا حصہ بن جاتے ہیں،اور اپنی کسی انتہائی نجی دنیا یا کسی مطلق خلوت کو شدت سے اتھل پتھل ہوتا دیکھتے ہیں؛ ہماری ارادیت، ہماری انفرادیت معانی کے اس کھیل میں بری طرح روندی جاتی ہے ۔ان معروضات کی روشنی میں شبلی کا یہ اقتباس دیکھیے :

بنوامیہ نے جب ظالمانہ حکومت شروع کی تو عرب کی خودسر طبیعتیں گوارہ نہ کرسکیں، اور بغاوتیں برپا ہوئیں۔ اس کے لیے ایک طرف تو حجاج وغیرہ جیسے ظالم مہیا کیے گئے کہ آزادی اور خودسری کو پامال کردیں، دوسری طرف مذہبی لوگوں کو رشوتیں دی گئیں کہ قضا و قدر کا مسئلہ پھیلائیں یعنی یہ کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے، اس کی شکایت خدا کی شکایت ہے۔ اس کے مقابلے میں معتزلہ نے عدل کا مسئلہ شائع کیا، یعنی یہ کہ خدا عادل ہے، اور وہ کبھی عدل کے خلاف نہیں کرتا۔ یہ دونوں خیالات ساتھ ساتھ رقیبانہ پھیلے لیکن ادھر تو حکومت کا زور ادھر چوتھی صدی کے آغاز سے آفتاب علم کا شروع ہوا، اور اشاعرہ کے خیالات تمام دنیا پر چھاگئے، جن سے یہ خیالات پھیلا دیے کہ خدا کے لیے عدل ضروری نہیں، بادشاہ خدا کا سایہ ہے، بادشاہ کی عزت خدا کی عزت اور اس کی توہین خدا کی توہین ہے۔ ان خیالات نے طبیعتوں کی آزادی، دلیری، راست گوئی، بلند ہمتی کا بالکل خاتمہ کردیا، اخلاق پر نہایت اعلیٰ درجے کی کتابیں لکھی گئیں، لیکن اخلاقی مسائل کے عنوان یہ ہیں: احسان، تواضع، حلم، عفو، سخاوت، توبہ وغیرہ وغیرہ۔ آزادی اور حق گوئی کا عنوان اخلاقی کتابوں میں نہیں مل سکتا۔ پند و موعظت کے سیکڑوں ہزاروں اشعار ہیں، لیکن دلیری اور آزادی کے مضامین خال خال ہیں ۲۸۔

اوائل بیسویں صدی میں یہ خیالات اردو تنقید میں خاصے انقلابی محسوس ہوتے ہیں۔ تقریباً تین دہائیوں بعد ترقی پسندوں نے 'معنی کی اس سیاست' کو طبقاتی پس منظر میں پیش کرنا شروع کیا۔ شبلی کو معنی کی اس سیاست کا خیال اتفاقاً نہیں سوجھا۔ انھوں نے خود اسی سیاست کو مستشرقین کی تحریروں میں کارفرما دیکھا تھا (جن کی طرف اشارہ گزشتہ صفحات میں کیا جاچکا ہے)۔ نیز علی گڑھ، جدید تعلیم، روم و روس کی جنگ، تحریک خلافت، کانگریس، مسلم لیگ ان سب میں انھوں نے خیالات کی آویزش کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے مورخانہ شعور نے بھی معنی و خیال کی سیاست کا راز ان پر کھولا تھا، کیوں کہ 'معنی کی سیاست' دراصل واقعات کے عقب میں دیکھنے یا واقعات کی علت تک پہنچنے کی کوشش کے نتیجے میں منکشف ہوتی ہے۔ شبلی واضح کرتے ہیں کہ کس طرح 'طبقہ علما' کے قائم کردہ معانی عوام کے تعقل و تخیل میں سرایت کرتے ہیں۔ شبلی نے اسی ذیل میں شیخ سعدی کے یہ اشعار پیش کیے ہیں:

به تهدید اگر برکشد تیغ حکم
بمانند کروبیان صم و بکم
وگر دردهد یک صلای کرم
عزازیل گوید نصیبے برم

ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "شیخ نے اپنی دانست میں خدا کے اعلیٰ ترین اوصاف بیان کیے لیکن غور کرو یہ کسی عادل شخص کے اوصاف ہیں، یا چنگیز خان اور ہلاکو کے۔ اگر شیخ سعدی یورپ کی طرز حکومت کو دیکھتے تو خدا کی یہ تعریف کرتے کہ قہر کی حالت میں بھی کسی بیگناہ کو اس کے مواخذہ کا خوف نہیں ہوسکتا، کیوں کہ سب جانتے

ہیں کہ اس کے ہاں کوئی بات خلاف اصول نہیں ہوسکتی"۔۲۹۔ اگر چہ شبلی یہاں واضح طور پر نو آبادیاتی آئیڈیالوجی کے زیر اثر ایشیائی طرز حکومت کے مقابلے میں یورپی طرز حکومت کی مدح کر رہے ہیں، اور اس مبالغے سے کام لے رہے ہیں، جس کی مخالفت میں انھوں نے کئی صفحے سیاہ کیے ہیں۔ نیز شبلی کی یورپ کے سلسلے میں رائے کو ان کے دو جذبی رجحان کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے: یہ کہ یورپ انصاف و بے انصافی میں مثالی ہے۔ تاہم جس نکتے کو ہم یہاں باور کرانا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ شبلی موضوع انسانی قطعی واضح لفظوں میں شاعر کے منشا کو معنی کی ساجیت کے ہاتھوں تشکیل پاتے دکھانا چاہتے ہیں؛ شاعر کے منشا کی تکمیل معنی کی اس سیاست کے ہاتھ میں ہے، جو شاعر پر غیر شعوری انداز میں حاوی ہوتی ہے۔ یہ سب شبلی کے اس تصور کے عین مطابق ہے کہ تخیل کا اصلی مواد مشاہدہ ہے، اور اچھی شاعری 'قریب الماخذ' ہوتی ہے۔ یعنی سعدی یہ طور شاعر وہی کہہ سکتے تھے جس کا ادراک وہ اردگرد کی دنیا میں کر رہے تھے؛ ان کا شعری تخیل، سماجی تعقل پر انحصار کر رہا تھا۔ اسی بات کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ سماجی تعقل (یا واضح لفظوں میں اشاعرہ کے قائم کردہ معانی، جنھیں بادشاہت کے ادارے کی زبردست تائید حاصل ہوگئی تھی) اپنے اثبات و فروغ مزید کے لیے شعری تخیل کو آلہ ء کار بنا رہا تھا، اور اسی عمل کے دوران میں شاعر کی ارادیت تحلیل ہوگئی تھی؛ شاعر مطالعہ ءنفس کے ذریعے نئے معانی خلق نہیں کر رہا تھا، وہ تعقلی وسماجی معنی کو جذبہ آفریں اسلوب میں پیش کر کے ان کی سماجی قبولیت کی راہ ہموار کر رہا تھا۔ شبلی جگہ جگہ شاعری کی جذباتی قوت کو باور کراتے ہیں۔ شعر کو وہ ایک ایسی قوت کہتے ہیں جس سے بڑے بڑے کام لیے جاسکتے ہیں، جیسے شریفانہ اخلاق پیدا کرنا۔ اس ضمن میں قدیم عربی شاعری سے وہ کئی مثالیں دیتے ہیں۔

معنی کی ساجیت اور معنی کی سیاست دراصل معنی کی چار سمت حرکت کے سبب ممکن ہوتی ہے۔ معنی کا جواب معنی ہے؛ مضمون کا جواب مضمون ہے؛ معنی کی ایک سمت حرکت کا جواب، دوسری سمت کی حرکت ہے۔ دوسرے لفظوں میں معنی کی ایک سمت حرکت پر اجارہ ہوسکتا ہے؛ اشاعرہ کے اس 'معنی' کہ عدل کا خدا کے لیے لازم نہیں، اس پر بادشاہ کا اجارہ ہوسکتا ہے، مگر اس معنی کا متبادل بھی ممکن ہے۔ متبادل معنی ہی معنی کی سیاست کے یک طرفہ اثر کو زائل کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب شاعر کا تخیل، اپنے زمانے کے تعقلی معنی پر انحصار کر رہا ہو، تو وہ متبادل معنی کیوں کر تخلیق کر سکتا ہے؟ وہ معنی کا جواب دینے معنی سے دینے کے بجائے، ایک ہی معنی کے اجارے کے عمل کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اسے اپنے شعور ذات یا موضوع انسانی کی تشکیل نہیں کرنا پڑتی۔ اسے ایک مستحکم و متحد موضوع انسانی ڈھلی ڈھلائی صورت میں 'باہر' سے مل جاتا ہے۔ یہی تصور اخلاق و قوی شاعری کی اساس ہے۔ شبلی واضح لفظوں میں کہتے ہیں کہ" اقسام شاعری مثلاً فلسفیانہ، اخلاقی، تاریخی، عشقیہ نیچرل، ان میں مبالغہ بالکل لغو چیز ہے"۔۳۰۔ معلوم نہیں اس کے بعد شاعری کی کون سے قسم رہ جاتی ہے، جس میں واقعیت سے گریز کیا جاسکتا ہے! الغرض شبلی معنی کی سیاست کا ادراک کرتے ہیں، مگر وہ اپنی تنقید میں ایک ایسے محفوظ لنگر کی تلاش کرتے محسوس ہوتے ہیں، جہاں شاعر مستقل، غیر متغیر عناصر سے اٹوٹ ربط برقرار رکھ سکے۔ چناں چہ شبلی شاعری کا رشتہ جہاں انسانی جذبات سے جوڑتے ہیں، وہاں ان جذبات کا ذکر کرتے ہیں جو کم و بیش سب انسانوں

میں پائے جاتے ہیں؛ یعنی رنج، خوشی، جوش، استعجاب وغیرہ۔ شبلی صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ ''انسانی معاشرت کی کل فلسفہ اور سائنس سے نہیں، بلکہ جذبات سے چل رہی ہے''۳۰۔

یہاں ایک بار پھر ہمیں شبلی کے یہاں دو جذبیت کی جھلک ملتی ہے؛ یعنی ایک طرح کا تضاد پیدا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے وہ تخیل کو فلسفے اور شاعری کی مشترکہ اساس قرار دے چکے ہیں، اور اب شاعری اور فلسفہ و سائنس کی الگ دنیاؤں پر زور دے رہے ہیں۔ پہلے وہ تخیل کو مشاہدات سے زیادہ سے زیادہ وابستہ رکھنے پر زور دیتے ہیں، اور اب سائنس و فلسفہ کو ''مشاہدات کی بے رحم حکومت'' سے تعبیر کرتے ہیں، جس کی جبریت سے شاعری نجات دلا سکتی ہے۔ اب وہ ذہنی اور حسی دنیا کی جدلیات ابھارتے ہیں؛ فلسفہ و سائنس کی ذہنی دنیا کو شاعری کی جذباتی دنیا کے مقابل رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے زاویے سے یہ جذبے اور معنی کی جدلیات ہے۔ جذبہ اپنے تغیر پذیر مزاج کے باوجود انسانی ہستی کا مستقل عنصر ہے۔ نیز یہ جن واقعات سے متعلق ہے، وہ بھی ابدی ہیں، جیسے محبت، موت، جدائی، وصال۔ جذبات کو برانگیخت کرنے والی شاعری ''مشاہدات کی بے رحم حکومت سے'' نجات دلاتی ہے۔ اس طرح شبلی شاعری کو ایک بالکل نجی، داخلی معاملہ قرار دیتے ہیں، جس کی مدد سے آدمی اپنے لیے باہر کی دنیا کے متوازی ایک اپنی جنت تعمیر کرتا ہے۔ سائنس کے مقابلے میں شاعری کی 'شفا بخشی' کا یہ رومانوی تصور شبلی کو عزیز محسوس ہوتا ہے، مگر یہ بات انھیں برابر کھٹکتی ہے کہ شاعری بہ ہر حال معنی (خواہ سے کس قدر ثانوی حیثیت دی جائے) رکھتی ہے، اور معنی جب قائم ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس پر سماجیت غالب آجاتی ہے؛ دوسرے لفظوں میں شاعری کی داخلی و نجی دنیا، اجتماعی سماجی دنیا سے ملوث ہو کر رہتی ہے۔ یہیں شبلی شاعری کی تفہیم میں اس بصیرت کو بروے کار لاتے ہیں، جسے انھوں نے علم کلام سے اخذ کیا ہے، تاکہ معنی کی اس آزادانہ حرکت کو محدود کیا جاسکے۔ علم کلام کی بصیرت شبلی کو دوجذبیت سے باہر آنے کا راستہ دکھاتی محسوس ہوتی ہے؛ انھیں دوجذبیت کے پرشور ساحل سے ایک محفوظ جزیرے پر لے جاتی ہے، جہاں تشکیک و تضاد کی مرکز شکن صورتِ حال کے بجائے ایقان و تطبیق کی مرکز مائل حالت ہوتی ہے۔ بجا کہ علمِ کلام کی بصیرت انھیں معنی کی دنیا میں لے جاتی ہے، مگر ان کی نظر میں 'معنی' کا معنی وہی محسوس ہوتا ہے، جو لفظ کا ہے، یعنی معنی، لفظ ہی کی طرح مستحکم ہے۔ وہ سگنی فائیڈ کو سیال نہیں سمجھتے، سگنی فائر کی طرح ثابت و محکم خیال کرتے ہیں۔ وہ معنی کی فطری حرکی خصوصیت کو قابو میں رکھنے کے لیے وہی حکمت عملی اختیار کرتے ہیں، جو علم کلام سے مخصوص ہے۔

علمِ کلام کو شبلی نے اپنے عہد میں درپیش مذہبی سوالات سے نبرد آزما ہونے کی خاطر اختیار کیا تھا۔ یہ سوالات اس یورپی سائنسی فکر کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے جسے سرسید حکمتِ جدیدہ کہتے تھے۔ حکمتِ قدیمہ (یعنی وہ یونانی علوم جن کے عربی تراجم عہد عباسی میں ہوئے تھے) نے مذہبی اعتقادات کے سلسلے میں تشکیک کو پیدا کیا تھا۔ یہی کام حکمت جدیدہ نے کیا۔ چناں چہ شبلی ایک نئے علم کلام کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ مذہبی اعتقادات کی 'اصل' اور 'اساسی، غیر مشتبہ معنی' کو قائم و مستحکم رکھنا شبلی کا مقصود تھا۔ اتفاق یہ ہے کہ جن دنوں شبلی نے موازنہ انیس و دبیر اور شعرالعجم اور سوانح مولانا روم لکھی تھیں، انھی دنوں ان کے ذہن پر کلام کے مسائل حاوی تھے۔ انھوں نے الغزالی

،الکلام اور علم الکلام حیدر آباد کے قیام (فروری ۱۹۰۱ء تا فروری ۱۹۹۵ء) کے دوران میں لکھی تھیں۔ (سرسید کے انتقال (۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء) کے بعد شبلی نے علی گڑھ کو خیر باد کہہ دیا تھا)۔ اس لیے اس بات کا قوی امکان ہے کہ کلام ،مذہبی عقائد کے اثبات میں جس تفہیمی و تعبیری طریقِ کار کو کام میں لاتا ہے، اسے ادبی متن کی تفہیم و تعبیر میں بھی بروے عمل لانے کی تحریک شبلی کو لاشعوری طور پر ہوئی ہو۔

علمِ کلام مستقل، ابدی معنی کے اثبات کا علم ہے۔ شبلی کی تنقید بھی شاعری میں مستقل اور غیر مبدل معنی کی تلاش کرتی نظر آتی ہے۔ مستقل ،ابدی معنی کے سلسلے میں بعض تغیر پذیر معانی (جنھیں فلسفہ و سائنس پیدا کرتے ہیں) تشکیک پیدا کرتے ہیں، یا اس پر سوال اٹھاتے ہیں، تغیر پذیر معانی کی ان کوششوں کا رد، علم کلام کی بنیادی خصوصیت ہے۔ شبلی کی تعریف کے مطابق تخیل، مشاہدے سے آزاد ہو کر کم و بیش وہی کام کرتا ہے، جو فلسفہ و سائنس کے تغیر پذیر معانی کرتے ہیں۔ مذہبی عقائد کے سلسلے میں تعقل کی آزادی کو محدود کرنا ضروری ہے، اور شاعری کے ضمن میں تخیل کی آزادی کو۔ شبلی دونوں کی آزادی کے حق میں نہیں تھے۔ ''کلام کی اصطلاح، جس کا لفظی مطلب 'تقریر' اور 'لفظ' ہے، یونانی فلسفیوں کی تحریروں کے عربی تراجم میں ،لوگوس کی اصطلاح کے متبادل کے طور پر استعمال ہوا ہے؛ اس کے مفاہیم میں 'لفظ'، 'تعقل' اور 'دلیل' شامل ہے''۔۳۲ شبیر احمد غوری کے بہ قول ''علم کلام کا آغاز اور اس کا فروغ نیز تدوین سب ایک مخالف عنصر کی رہین منت ہیں''۳۳۔ یہ مخالف عنصر عقلیت اور تفلسف تھا۔ چناں چہ شبلی نے کلام کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''علمِ کلام حقیقت میں دو چیزوں کا نام ہے: اثبات اور ابطال، یعنی فلسفے وغیرہ کا ابطال اور عقائد اسلام کا اثبات''۳۴۔ شبلی کے زمانے میں 'فلسفہ وغیرہ' سے مراد یورپی سائنسی فکر تھی۔

جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں لکھ آئے ہیں، تب یورپ 'نمائندگی کا ہشت پہلو نظام' تھا. ہر یورپی شے، ہر یورپی فکر محض ایک شے یا ایک فکر نہیں سمجھی جاتی تھی، ایک سیاسی و ثقافتی طاقت کی نمائندہ سمجھی جاتی تھی۔ لہٰذا شبلی جس نئے علم کلام کو پیش کر رہے تھے ،وہ محض نئی فکر کے ابطال کا نام نہیں تھا، بلکہ اس ابطال کے ذریعے یورپی فکر کے استناد اور جواز پر بھی سوالیہ نشان لگاتا تھا۔ اسی بات کو ہم دوسرے طریقے سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ سرسید کی نظر میں بھی حکمتِ جدیدہ کا چیلنج تھا۔ انھوں نے دو راستے سجھائے تھے: حکمت جدیدہ کا بطلان یا اس سے مطابقت۔ خود انھوں نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا۔ (شبلی اپنے علمِ کلام میں پہلے راستے پر چلے)۔ سرسید بھی حکمتِ جدیدہ کو یورپ سے ،یعنی نمائندگی کے ہشت پہلو نظام سے الگ نہ کر سکے؛ اسی لیے یورپی علوم کے ساتھ یورپی ثقافت کی تقلید پر زور دینے لگے ،جس کا ثبوت ان کا یہ قول ہے کہ ''اگر ہم اپنی اصلی ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان تک کو بھول جائیں۔ تمام مشرقی علوم کو نسیاً منسیاً کر دیں۔ ہماری زبان یورپ کی اعلیٰ زبانوں میں سے انگلش یا فرنچ ہو جائے''۳۵۔ اس کے مقابلے میں شبلی کو اصلی ترقی اپنے علوم اور زبانوں کے تحفظ میں نظر آتی تھی۔ شبلی کے لیے ماضی کے عرب کی وہی غیر معمولی علامتی معنویت تھی جو سرسید کے لیے انگلستان کی تھی۔ شبلی کو عرب اور عربی میں وہ سب مثالی خوبیاں نظر آتی تھیں، جو سرسید کے مطابق انگلستان اور انگریزی میں تھیں۔ بہ قول شبلی: ''آزادی عرب کا مایۂ خمیر ہے۔ بلند خیالی ،دلیری ،آزادی ،حوصلہ مندی کی جو مثالیں تاریخ عرب کے ہر صفحے میں ملتی ہیں ،آج یورپ

بھی اس قسم کے واقعات پیش نہیں کر سکتا"۳۶۔لہٰذا شبلی کا علمِ کلام حکمت جدیدہ سے مطابقت کے بجائے ،اس کے ابطال سے عبارت تھا؛اور حکمت جدیدہ کے مقابلے میں جب وہ عقائد اسلام کے اثبات کی سعی کرتے تھے،تو اس سعی کی نوعیت خالص علمی یا اکیڈمک تھی،مگر اس کی معنویت سیاسی تھی۔شبلی کی متکلمانہ فکر مذہب اسلام کے مستقل ،ابدی معنی کے اثبات کے ذریعے ،ایک 'سیاسی معنی' بھی تشکیل دیتی تھی :یہ کہ یورپ رفلسفے رسائنس کے تغیر پذیر رکثیر معانی کے مقابلے میں مشرق رمذہب راسلام واحد،مستحکم ومحکم معنی کا حامل ہے۔یہ طریق فکر انھیں زیادہ سے زیادہ ماضی کی طرف رجوع کرنے پر مائل رکھتا تھا۔

شبلی کی ادبی تنقید پر علم کلام کی منطق کا کس قدر اثر ہے،اس کی سب سے اہم شہادت سوانح مولانا روم میں ملتی ہے، جسے انھوں نے قیام حیدر آباد کے زمانے (۱۹۰۴ء) میں لکھا تھا۔اس کتاب میں لکھتے ہیں:

> مثنوی نے عالم شہرت میں جو امتیاز حاصل کیا،آج تک کسی مثنوی کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس قدر مقبول ہونے اور ہزاروں لاکھوں دفعہ پڑھے جانے کے بعد بھی لوگ اس کو جس حیثیت سے جانتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ وہ تصوف اور طریقت کی کتاب ہے۔یہ کسی کو خیال بھی نہیں آیا کہ وہ صرف تصوف نہیں بلکہ عقائد اور علم کلام کی بھی عمدہ ترین تصنیف ہے۳۷۔

اسی لیے وہ اسے سلسلہ کلامیہ کا چوتھا حصہ کہتے ہیں۔یہاں مقصود اس کتاب کا تجزیہ نہیں،بلکہ اس طریق کار کا جائزہ لینا ہے، جسے وہ ایک شاعری کی کتاب کے مطالعے میں بروئے کار لاتے ہیں۔مثنوی کو تصوف اور طریقت (جن سے شبلی کو کم ہی دل چسپی تھی) سے زیادہ عقائد اور علم کلام کی کتاب قرار دینا،اس بات کی شہادت ہے کہ شبلی شاعری میں ان معانی کی دریافت کو اہمیت دے رہے تھے، جو حقیقتاً شعری تخیل کی پیداوار نہیں ؛وہ پہلے سے موجود ہیں،شاعری انھیں زیادہ سے زیادہ مؤثر پیرائے میں پیش کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔شبلی شعری تخیل کی خلق معنی کی صلاحیت کی بجائے ،شاعری کی مستحکم معنی کی ترسیل کی صلاحیت کو اجاگر کررہے تھے شبلی کا منشا ہو یا نہ ہو،ان کے طریق کار سے شعری تخیل اور شاعری میں فرق پیدا ہورہا تھا ؛شعری تخیل قوتِ ایجاد ہے ،اور شاعری اظہار کا مؤثر پیرایہ ہے۔شبلی شاعری کے مؤثر پیرایہ اظہار ہونے پر زیادہ سے زیادہ زور دے رہے تھے۔ چناں چہ انھوں نے مثنوی کے مطالعے میں ان اشعار اور حکایات کو خاص طور پر اجاگر کیا ہے جن میں اسلامی عقائد کے حق میں مؤثر شاعرانہ استدلال کیا گیا ہے۔مثلاً شبلی مثنوی سے یہ شعر درج کرتے ہیں: 'بے جہت دان عالم امرا ےصنم ربے جہت تر باشد آمر لاجرم' (اے یار عالم روح جہت سے منزہ ہے تو عالم روح کا خالق اور بھی منزہ ہوگا) ہیں،اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "متکلمین کے استدلال سے اگر ثابت ہوتا تھا تو صرف اس قدر کہ خدا علۃ العلل ہے،لیکن اس کا منزہ ، بری عن المادۃ اور اشرف الموجودات ہونا ثابت نہیں ہوتا تھا،لیکن بخلاف اس کے مولانا کے استدلال سے خدا کی ذات کے ساتھ ،اس کے صفات بھی ثابت ہوتے ہیں،اس کے ساتھ مادئین کے مذہب کا ابطال بھی ہوتا ہے"۳۸۔گویا مولانا روم کا استدلال ،متکلمین کے استدلال سے زیادہ مؤثر، قوی اور گہرا ہے۔کیا شبلی یہ سمجھتے ہیں کہ شاعرانہ

استدلال، کسی دوسرے استدلال کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہے؟ممکن ہے سمجھتے ہوں، مگر وہ یہاں مولانا روم کے استدلال کو شاعرانہ نہیں منطقی استدلال کے طور پر ہی زیر بحث لاتے ہیں۔شاعرانہ استدلال بلا شبہ موجود ہے، مگر شبلی کی مطالعاتی حکمت عملی سے یہ نمایاں نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ علم کلام اور شاعری کے مطالعے میں علم کلام کی منطق بروئے کار لانے میں ایک 'بڑی مشکل' ہے۔مثلاً دیکھیے کہ علم کلام، فلسفے کا ابطال کرتا ہے، مگر اس کے لیے فلسفے ہی کو کام میں لاتا ہے۔دوسرے لفظوں میں مذہبی عقائد کے اثبات کے لیے، فلسفیانہ عقلی طریق کار سے کام لیتا ہے۔علم کلام جن شبہات کو رفع کرنا چاہتا ہے، ان کو تقویت دینے کا امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے۔کیوں کہ عقلی طریق کار جن شبہات کو رفع کرنا چاہتا ہے، وہ اسی طریق فکر ہی کی پیداوار ہوتے ہیں۔اسی لیے سید سلیمان ندوی نے اپنے استاد کے طریق کار سے اختلاف کیا، اور لکھا کہ "اس سے وہ اعتراضات اور شبہات ان لوگوں میں بھی پھیلتے ہیں، جو ان سے واقف نہیں" ۳۹۔سید صاحب نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا کہ جن علوم سے شبہات پیدا ہوتے ہیں "پہلے ان جدید علوم کو مسلمان بنانا چاہیے، پھر ان کو مسلمانوں میں رواج دینا چاہیے، ورنہ بغیر اس کے وہی باطنیت اس زمانہ میں بھی پھیلے گی جو امام غزالی سے پہلے پھیلی تھی" ۴۰۔.....برسبیل تذکرہ علوم کو مسلمان بنانے کا 'انقلابی خیال' ضیا دور سے کافی پہلے ہی پیش ہو چکا تھا۔سید صاحب نے اس پر بحث نہیں کی کہ علوم کس مفہوم میں کافر ہوتے ہیں، تاہم انھیں مسلمان بنانے کا نسخہ ضرور بتایا ہے کہ غزالی کی طرح جدید علوم کے تراجم پیش کرنے کے بجائے ان علوم پر اسلامی طرز پر کتابیں لکھی جائیں۔'کافرانہ علوم' پر اسلامی طرز کی کتابیں لکھنے سے علوم مسلمان ہوتے ہیں یا نہیں، کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتے، مگر اس سے ان علوم کے سلسلے میں نفرت کا رویہ ضرور پروان چڑھتا ہے۔یہ رویہ ہم تقریباً سب مسلمان ملکوں میں مشاہدہ کر سکتے ہیں۔یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نفرت اگر ایک آگ ہے تو اس میں خود نفرت کرنے والا ہی جل کر بھسم ہوتا ہے ......بہر کیف یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ علم کلام سے فلسفے کی روح کا نکلنا ممکن نہیں، خواہ فلسفے کو کس قدر برا بھلا کہا جائے، اور اسی طرح شاعری کے کسی بھی طرح کے مطالعے سے اس کی خلق معنی کی روح کو خارج کرنا ممکن نہیں، خواہ اسے کس قدر محض ایک ظرف (container) سمجھا جائے۔ایک میں تعقل اور دوسری میں تخیل کو دبایا جاتا ہے تو وہ اسی دبانے کے عمل ہی میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔غالب کا یہ شعر اسی صورت حال کی ترجمانی کرتا ہے۔

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے کو ان بتوں سے بھی نسبت ہے دور کی

گویا علم کلام سے فلسفے کو، اور شاعری سے تخیل کو خواہ کس قدر دیس نکالا دیا جائے، دونوں کی نسبت یا کم از کم ان کا نقش مبہم (یعنی Trace) باقی رہتا ہے۔نقش مبہم کا معاملہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنی جھلک دکھلاتا رہتا ہے، بلکہ کسی متن کے بالائی معنی کو، یا مصنف کے دعووں کو، اپنی حاشیائی حیثیت کے باوجود، تہ وبالا کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ بھی کرتا رہتا ہے۔مثلاً یہی دیکھیے کہ شبلی مولانا روم کے صرف وہ اشعار درج کرتے ہیں، جن میں منطقی استدلال ہے، مگر چلتے چلتے شبلی، مولانا کا ایک ایسا شعر درج کر جاتے ہیں جس میں تخیل کی اسی ایجاد معنی کی صلاحیت

کا بیان ہے، جسے شبلی دہاتے ہیں۔شعر دیکھیے:

بے نہایت کیشہا دیشہا

جملہ ظل صورت اندیشہا

یعنی بے اندازہ مذاہب اور پیشے، سب خیالات کے پرتو ہیں۔آگے بڑھنے سے پہلے ذرا غالب کے بھی دو فارسی شعر دیکھتے چلیے، جو اسی موضوع سے متعلق ہیں۔

کفر و دیں چیست جز آلائش پندار وجود

پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو شود

[تیرے غلط تصور خودی کے سوا کفر و دیں کیا ہے۔اس آلائش سے پاک ہو جا تاکہ تیرا کفر بھی تیرا ایمان بن جائے]

خوش بو د فارغ زبند کفر و ایماں زیستن

حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن

[کفر و ایماں کے خرخشوں سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرنا کس قدر پرلطف ہے۔کافر رہ کر مرنا اور مسلمان ہو کر جینا دونوں پر افسوس]

حقیقت یہ ہے کہ غالب نے رومی ہی کی بات کو آگے بڑھایا ہے۔غالب نے خیالات کے پرتو کے ساتھ پندار وجود کا اضافہ کر دیا ہے۔نیز اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ فساد کی جڑ یہی پندار وجود ہے۔خود رومی کے شعر میں یہ معنی مضمر ہے کہ اگر جملہ مذاہب خیالات کے پرتو ہیں، تو ان میں اس جنگ کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے، جو سچائی کے واحد دعوے دار ہونے کے نام پر ادا، ایک دوسرے پر بالادستی کی خاطر ان میں برپا کی جاتی ہے۔یہ 'معنی' متکلمانہ تعقل کی پیداوار نہیں، شعری تخیل کی تخلیق ہیں۔شعری تخیل کا کوئی مذہب نہیں، کوئی پیشہ نہیں، کوئی سرحد نہیں؛ وہ ان سب سے بلند اور ان سب پر حاوی ہے۔وہ انھیں خلق کر سکتا ہے؛ معنی کی آزادانہ حرکت کو جاری رکھ سکتا ہے، استعارہ سازی کر سکتا ہے، متبادلات تخلیق کر سکتا ہے۔خلیفہ عبدالحکیم نے عارف رومی کو تشبیہ و تمثیل کا بادشاہ کہا ہے[۱۳]، اور اس طرح ان کے شعری تخیل کی بے مثال زرخیزی کی داد دی ہے۔شبلی کی متکلمانہ تعبیر میں شاعری کے اس کردار کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ وہ متبادلات تخلیق کر سکتی ہے؛ کم کہہ کر زیادہ کا ابلاغ کر سکتی ہے؛ ان خاموشیوں کو تخلیق کر سکتی ہے جنھیں چشم خیال سے 'سنا' جا سکتا ہے؛ ان وقفوں کو خلق کر سکتی ہے، جو دو لفظوں، دو مصرعوں کے بیچ میں ہوتے ہیں، مگر ان میں معانی کا حشر برپا ہوتا ہے؛ نیز دوہرے تہرے تناظرات مہیا کر سکتی ہے؛ اور ایک نظام کے استبداد کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔حالاں کہ ابتدا میں شبلی کی تنقیدی تحریریں (جب وہ دو جذبی رجحان کی حامل تھیں) اس بات کا امکان رکھتی تھیں۔

حوالہ جات و حواشی:

۱۔ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، (بک ٹاک، لاہور، ۲۰۱۴ء)، ص ۳۲۹۔
۲۔ ایضاً، ص ۱۸۲-۱۸۳۔
۳۔ ایضاً، ص ۱۸۱۔
۴۔ ایس۔ ایم۔ اکرام، یادگارِ شبلی، (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۹۴ء)، طبع دوم، ص ۱۱۱۔
۵۔ بل اشرافٹ و دیگر، *Postcolonial Studies: The Key Concepts*، (روٹلیج، امریکا، ۲۰۱۳ء، طبع سوم)، ص ۱۴۔
۶۔ شبلی نعمانی، سفرنامہ روم و مصر و شام، (قومی پریس، دہلی، ۱۹۲۸ء)، ص ۷۔
۷۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد اول و دوم، (الفیصل، لاہور، ۲۰۱۴ء)، ص ۶۔
۸۔ ایضاً، ص ۱۱۔
۹۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد چہارم، (الفیصل، لاہور، ۲۰۱۴ء)، ص ۵۔
۱۰۔ جون اسٹوارٹ مل، *On Liberty*، (جون ڈبلیو پارکر اینڈ سن، لندن، ۱۸۵۹ء)، ص ۲۳۔
۱۱۔ مل نے یہ مضمون اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں لکھا ہے۔ وہ شاعری کو دیگر ادبی اصناف اور علوم سے ممیز کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں شاعری کی خصوصیت جذبات کو متاثر کرنا ہے۔ وہ ورڈز ورتھ کی مانند سائنس کو شاعری کی ضد سمجھتے ہیں۔ سائنس ہمیں قائل کرتی ہے، مگر شاعری ہمارے دل میں تحریک پیدا کرتی ہے۔ شبلی بھی اسی خیال کو دہراتے ہیں۔ مل کے مضمون کے مکمل حوالے کے لیے ملاحظہ کیجیے:

Dissertations and Discussions,Political, Philosophical, and Historical] جلد اول، (جون ڈبلیو پارکر اینڈ سن، لندن، س ن)، ص ۶۳ تا ۹۴ [
۱۲۔ پی بی شیلے، A Defence of Poetry an Essay مشمولہ ***Essays and Letters from Abroad***، جلد اول (مرتبہ مسز شیلے)، (ایڈورڈ میکسون، لندن، ۱۸۴۰ء)، ص ۱۲۔
۱۳۔ رابرٹ سی سلمان، Robert C. Solomon, ***Continental Philosophy***, since 1750، (اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، لندن، ۱۹۸۸ء)، ص ۷۔
۱۴۔ ایس۔ ٹی۔ کالرج، *Biographia Literaria*، (لیوٹ لارڈ اینڈ کمپنی، نیویارک، ۱۸۳۴ء)، ص ۱۲۱۔
۱۵۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد چہارم، متذکرہ بالا، ص ۶۔
۱۶۔ ایضاً، ص ۷۔
۱۷۔ محمد حسن عسکری، مجموعہ محمد حسن عسکری، (سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۹۲۔
۱۸۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد چہارم، متذکرہ بالا، ص ۲۷، ۲۸۔
۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱۔
۲۰۔ ایضاً، ص ۴۰۔
۲۱۔ ایضاً، ص ۴۳۔

۲۲۔ ایضاً،ص ۷۷۔
۲۳۔ ایضاً،ص ۵۶۔
۲۴۔ ایضاً،ص ۵۸۔
۲۵۔ ایضاً،ص ۵۹۔
۲۶۔ ژاک دریدا، *Of Grammatology*،(مترجم گائتری چکراورتی)،(جان ہاپکنز یونیورسٹی پریس ، امریکا، ۱۹۹۷ء)،ص ۴۹۔
۲۷۔ آل احمد سرور،''شبلی میری نظر میں''،کریسنٹ،شبلی نمبر،(گورنمنٹ اسلامیہ کالج ،ریلوے روڈ لاہور، جنوری ۱۹۷۱ء)ص ۱۱۸۔
۲۸۔ شبلی نعمانی ،شعر العجم ،جلد چہارم ،متذکرہ بالا،ص ۱۴۴۔۱۴۵۔
۲۹۔ ایضاً،ص ۱۴۳۔
۳۰۔ ایضاً،ص ۷۵۔
۳۱۔ ایضاً،ص ۸۰۔
۳۲۔ ہنری آسٹرن وولفسن ،*The Philosophy of the Kalam*،(ہاورڈ کالج ، امریکا، ۱۹۷۶ء)،ص ۱۔
۳۳۔ شبیر احمد غوری، اسلامی ہند میں کلام و فلسفہ، (خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ، پٹنہ، ۱۹۹۷ء)،ص ۱۱۔
۳۴۔ شبلی نعمانی، الغزالی ، (رحمانی پریس ، دہلی، ۱۹۲۵ء)،ص ۵۶۔
۳۵۔ سرسید احمد خان، خود نوشت افکار سرسید (مرتبہ ضیا الدین لاہوری)، (فضلی سنز، کراچی، ۱۹۹۸ء)،ص ۲۰۷۔
۳۶۔ شبلی نعمانی، مقالات شبلی ،جلد سوم (مرتبہ سید سلیمان ندوی)،نیشنل بک فاؤنڈیشن ، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء،ص ۱۶۹۔
۳۷۔ شبلی نعمانی ،سوانح مولانا روم، (نامی پریس ،کان پور، ۱۹۰۶ء)،ص ۱۰۴۔
۳۸۔ ایضاً،ص ۱۱۲۔
۳۹۔ ایس ۔ایم ۔اکرام ،یادگارِ شبلی ،متذکرہ لا بالا،ص ۲۷۱۔
۱۰۔ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی ،متذکرہ بالا،ص ۳۹۔
۴۱۔ خلیفہ عبدالحکیم، تشبیہات رومی ، (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء)،ص ۶۔

قلمی معاونین

☆ ڈاکٹر تحسین فراقی	مجلس ترقی ادب، ۲-کلب روڈ، لاہور
☆ ڈاکٹر سعادت سعید	شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور
☆ انیس اشفاق	استاد شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ، بھارت
☆ سہیل عباس بلوچ	استاد شعبۂ اردو، جامعہ ٹوکیہ برائے مطالعاتِ خارجی، ٹوکیو جاپان
☆ ڈاکٹر نثار ترابی	صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج آف کامرس، راولپنڈی
☆ محمد امجد عابد	استاد شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور
☆ ڈاکٹر منور ہاشمی	شعبۂ اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد
☆ ڈاکٹر یاسمین سرور	شعبۂ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین، قصور
☆ ڈاکٹر قدیر انجم	استاد شعبۂ اردو، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور
☆ ڈاکٹر شگفتہ فردوس	۵۵-ایف، عسکری-I، لاہور کینٹ
☆ ڈاکٹر زاہد منیر عامر	پروفیسر شعبۂ اردو، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، لاہور
☆ ڈاکٹر ناصر عباس نیر	اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Maulana Shiblee Naumani SPECIAL ISSUE

BĀZYĀFT

27

A Research Journal

ISSN: 1992 - 3678

Editor
Dr. Muhammad Kamran

Department of Urdu
Oriental College, University of the Punjab
Lahore - Pakistan